مارگریت دِیُوراس
عاشق
alhamra

مارگریت دیوراس

عاشق

فرانسیسی سے براہ راست ترجمہ

شفیق ناز

یہ کتاب الحمرا پبلشنگ نے، سفارت خانہ فرانس، اسلام آباد، پاکستان
اور فرانسیسی وزارت برائے اُمورِ خارجہ کے تعاون کے ساتھ،
اِشاعتی پروگرام پ آ پ محمد اقبال، کے تحت شائع کی ہے۔

فرانسیسی زبان میں کتاب کا نام: لاماں/ L'AMANT
© لیزایدیسیوں دُمِنوئی، پیرس، 1984
© 2004 شفیق ناز برائے اُردو ترجمہ
طبع اول: اکتوبر 2004
طابع: الحمرا پرنٹنگ پریس
ناشر: شفیق ناز۔ الحمرا پبلشنگ۔ اسلام آباد

Aashiq
Original Title in French : **L'AMANT**
by: Marguerite Duras
Translated by: Shafiq Naz

Alhamra Publishing, Islamabad, Pakistan

Printed in Pakistan - ISBN: 969-516-153-7

عاشق

ایک دن کا ذکر ہے، میں پہلے ہی سے بڑھاپے میں داخل ہو چکی تھی ، ایک عوامی عمارت کے دالان میں ایک آدمی میری طرف آیا۔ اُس نے اپنا تعارف کرایا اور مجھے کہنے لگا: ''میں آپکو بہت عرصے سے جانتا ہوں۔ ہر کسی کا کہنا ہے کہ جب آپ جوان تھیں تو آپ بہت خوبصورت تھیں، میں آپکو یہ کہنے آیا ہوں کہ میرے لیے جوانی کے زمانے کی بنسبت آپ اب زیادہ خوبصورت ہیں، مجھے آپ کا جوانی والا چہرہ کم پسند تھا بنسبت آپ کے آج کل کے چہرے کے، شکست خوردہ۔''

میں اکثر اس تصویر کے بارے میں سوچتی ہوں جسے صرف میں ہی دیکھ سکتی ہوں اور جس کے بارے میں میں نے کبھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ یہ تصویر اُسی سکوت میں میری آنکھوں کے سامنے ہمیشہ موجود رہتی ہے، حیرت انگیز۔ اپنی تمام تصویروں میں مجھے صرف یہی پسند ہے، تصویر جس میں میں اپنے آپ کو پہچان سکتی ہوں ، اور جسے دیکھ کر مجھے انتہائی خوشی محسوس ہوتی ہے۔

میری زندگی میں بہت جلد ہی بہت دیر ہو گئی تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ہی بہت دیر ہو گئی تھی۔ اٹھارہ سال اور پچیس سال کی عمر کے دوران میرے

چہرے نے ایک غیر متوقع سمت اختیار کرلی۔ میں اٹھارہ سال کی عمر میں ہی بوڑھی ہوگئی۔ میں نہیں جانتی کہ آیا سب لوگوں کے ساتھ ایسے ہی ہوتا ہے، میں نے کبھی کسی سے پوچھا نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ وقت کبھی کبھار اُس زمانے میں بہت تیزی سے گزرتا ہے جب ہم اپنی زندگی کے پر شباب اور بہترین دن گزار رہے ہوتے ہیں۔ یہ بڑھاپا یک لخت آیا تھا۔ میں نے اسے اپنے خدوخال پر ایک ایک کرکے چھاتے ہوئے، اُن کی باہم رنگی کو بدلتے ہوئے، آنکھوں کو مزید بڑا کرتے ہوئے، نگاہوں میں اُداسی لاتے ہوئے، منہ کو پکّا کرتے ہوئے، اور پیشانی میں گہری لکیریں چھوڑتے ہوئے دیکھا۔ لیکن اس عمل سے خوف زدہ ہونے کی بجائے میں نے اپنے چہرے پر پھیلتے ہوئے اس بڑھاپے کو اُتنی ہی دلچسپی سے دیکھا جتنی کہ مثال کے طور پر، میں ایک کتاب کو پڑھنے میں لیتی ہوں۔ اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ میرا یہ خیال غلط نہیں تھا کہ ایک دن یہ عمل آہستہ ہوجائے اور اپنا حسب معمول راستہ اختیار کرلے گا۔ وہ لوگ، جن سے میں سترہ سال کی عمر میں فرانس میں ایک سفر کے دوران ملی تھی، وہ مجھے دو سال کے بعد، انیس سال کی عمر میں دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ وہ والا چہرہ، نیا چہرہ، ابھی تک میرے ساتھ ہے۔ یہی میرا چہرہ رہا ہے۔ یقیناً اس چہرے پر مزید بڑھاپا چھا گیا ہے، لیکن بنسبت اُس کے کچھ کم کہ جتنا ہونا چاہیے تھا۔ میرے چہرے پر گہری اور خشک سلوٹیں ہیں، اور جلد پھٹی ہوئی ہے۔ لیکن یہ چہرہ اُس طرح

بیٹھ نہیں گیا جیسے کہ کچھ نازک خدوخال والے چہروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسکی ہیئت پہلے کی طرح برقرار ہے لیکن اس کا مادہ تباہ ہو چکا ہے۔ میرا چہرہ ایک تباہ شدہ چہرہ ہے۔

تو میں آپ کو پھر بتاؤں، میری عمر ساڑھے پندرہ سال ہے۔

میں دریائے میکونگ کو پار کرنے کے لئے ایک کشتی پر سوار ہوں۔

دریا کو پار کرتے ہوئے تمام وقت وہی تصور میرے ذہن میں ابھرتی ہے۔

میں ساڑھے پندرہ سال کی ہوں، اِس مُلک میں کوئی موسم نہیں ہوتے، یہاں ہم ایک یکتا موسم میں ہی رہتے ہیں، گرمی کا موسم، یکساں، ہم یہاں کرۂ زمین کے ایک طویل اور گرم حصے میں رہتے ہیں، جہاں نہ موسمِ بہار ہے اور نہ نو بہاری۔

میں سائیگون میں حکومت کے ایک بورڈنگ سکول میں رہتی ہوں۔ میرا کھانا پینا اور سونا یہاں ہوتا ہے، اسی بورڈنگ سکول میں، لیکن پڑھتی میں باہر ہوں، فرانسیسی ہائی سکول، لیسے میں۔ میری ماں، جو اُستانی ہے، اُسکی خواہش ہے کہ اُس کی ننھی بیٹی ثانوی تعلیم پوری کرے۔ تمھارے لیے بہت ضروری ہے کہ تم ہائی سکول ختم کرو۔ جو کچھ اُس کے لیے کافی تھا، وہ اُس کی ننھی بیٹی کے لیے کافی نہیں۔ پہلے ہائی سکول اور پھر ریاضی میں ایک اچھی ڈگری تا کہ میں اُستانی بن سکوں۔ یہ رٹ میں ہمیشہ اپنے سکول کے ابتدائی سالوں سے ہی

سنتی آ رہی ہوں۔ میں نے کبھی یہ تصور بھی نہیں کیا کہ میں ریاضی کی ڈگری سے پیچھا چھڑا سکوں گی، مجھے خوشی تھی کہ میری ماں کی اُمید بندھی ہوئی ہے۔ میں نے ہمیشہ اپنی ماں کو، اپنے اور اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں ہر روز منصوبہ بندی کرتے ہوئے دیکھا۔ اور پھر ایک دن آیا جب اُسے اپنے بیٹوں کے لئے بڑے بڑے منصوبے بنانا ترک کرنا پڑا، تو اُس نے دوسرے منصوبے بنانا شروع کردیئے، کچے دھاگوں کے بنے ہوئے مستقبل کے منصوبے، لیکن وہ بھی ایک طرح سے کچھ نہ کچھ مقاصد پورے کرتے تھے، کیونکہ وہ آنے والے وقت کو روکتے تھے۔ مجھے اپنے چھوٹے بھائی کے کھاتہ نویسی کے تمام نصاب یاد ہیں۔ یونیورسل کارسپونڈنس سکول کے، ہر سال کے، ہر کلاس کے۔ تمہارے لیے بہت ضروری ہے کہ تم اپنی پڑھائی مکمل کرو، میری ماں اُسے کہتی، لیکن یہ سلسلہ تین دن تک چلتا، چار دن کبھی نہیں، کبھی نہیں۔ کبھی بھی نہیں۔ جب ماں کا کسی دوسری جگہ تبادلہ ہو جاتا تو ہمیں یونیورسل سکول بھی چھوڑنا پڑتا۔ یوں ایک بار پھر دوبارہ سے وہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ ماں نے دس سال تک ہمت نہ ہاری۔ لیکن بے فائدہ۔ چھوٹا بھائی سائیگون میں اکاؤنٹنٹ کلرک بن گیا۔ چونکہ اس کالونی میں کوئی ویولے ٹیکنکل سکول نہیں، اس لئے بڑے بھائی کو پڑھائی کی خاطر فرانس جانا پڑا، کچھ سال وہ فرانس میں رہا تاکہ ویولے سکول میں تعلیم حاصل کرے۔ لیکن اُس نے تعلیم مکمل نہیں کی۔ میری ماں کو یقیناً اس بات کا علم تھا لیکن وہ بالکل لاچار تھی۔

اُس بیٹے کو دوسرے بچوں سے علیحدہ کرنا ضروری تھا۔ کئی سال تک تو وہ خاندان کا حصہ ہی نہیں تھا۔ اُس کی غیر موجودگی کے دوران ہی ماں نے زمین خریدی تھی۔ یہ کاروبار پُر مصائب تھا، لیکن ہم بچوں کے لیے جو اُس کے پاس رہتے تھے، یہ اتنی بڑی مصیبت نہیں تھی جتنی رات کو بچوں کے قاتل کی موجودگی، شکاری کی رات۔

مجھے اکثر کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سارا بچپن انتہائی شدید دھوپ میں گذارنے کی ہے، لیکن میں نے اس پر کبھی یقین نہیں کیا۔ مجھے یہ بھی کہا گیا کہ اس کی وجہ وہ خیالات ہیں جن میں ہمیں غربت نے دھکیل دیا تھا، لیکن بالکل نہیں، یہ بھی وجہ نہیں ہے۔ مسلسل بھوک کی وجہ سے بچے، چھوٹے بوڑھوں کی طرح، ہاں، لیکن ہم، نہیں، ہم کبھی بھوکے نہیں رہے، ہم سفید چمڑی والے بچے تھے، ہم شرمسار تھے، ہم اپنا فرنیچر بیچتے تھے، لیکن ہم بھوکے نہیں تھے، ہمارے ہاں ایک نوکر تھا اور ہم، کبھی کبھی، یہ سچ بات ہے، ہم گندگی، بگلے، چھوٹے چھوٹے مگرمچھ بھی کھالیتے تھے، لیکن یہ گند بلا ہمارا ایک نوکر پکاتا تھا اور ہمیں پیش بھی کرتا تھا، اور کبھی کبھار ہم کھانے سے انکار بھی کردیتے تھے۔ ہم کھانا کھانے سے انکار کی عیاشی بھی کرتے تھے۔ جب میں اٹھارہ سال کی تھی تو کچھ ایسا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے یہ چہرہ وجود میں آیا۔ یہ یقیناً رات کے وقت پیش آیا ہوگا۔ مجھے اپنے آپ سے خوف تھا، مجھے خدا سے

خوف تھا۔ جب دن ہوتا تو مجھے کم خوف ہوتا اور موت کم سنگین دکھائی دیتی۔ لیکن وہ ہمیشہ میرے ارد گرد منڈلاتی رہتی۔ میں قتل کرنا چاہتی تھی، اپنے بڑے بھائی کو، میں اُسے قتل کرنا چاہتی تھی، اُس پر غالب آنے کے لئے ایک دفعہ، صرف ایک دفعہ، اُسے مرتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کا مقصد ماں کے سامنے سے اس کی محبت کے مفعول کو ہٹانا تھا، اس بیٹے کو، ماں کو اس سے اتنی زیادہ، اتنے برے طریقہ سے، محبت کرنے کی سزا دینے کے لئے، اور خاص طور پر اپنے چھوٹے بھائی کو بچانے کے لئے، یہ بھی میرا اپنا خیال تھا، میرا چھوٹا بھائی، میرا بچہ، میرے بڑے بھائی کی خوشگوار زندگی اس کی زندگی کے اوپر براجمان، روشنی کے اوپر، اس سیاہ نقاب کو، اس کے وضع کیے ہوئے قانون کو، اس کے چلائے ہوئے قانون کو، ایک انسان کو، اور جو حیوانی قانون تھا، اور جو اس چھوٹے بھائی کو، ہر روز کے ہر لمحے کی زندگی سے خوف دلاتا تھا، اتنا خوف کہ ایک دن وہ اس کے دل تک پہنچ گیا اور اُس کی موت کا باعث بنا۔

میں نے اپنے خاندان کے ان لوگوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے، لیکن جب میں ایسا کررہی تھی تو وہ ابھی تک زندہ تھے، ماں اور میرے بھائی، اور میں نے ان کے ارد گرد لکھا، ان چیزوں کے ارد گرد اور بغیر ان چیزوں کے بیچ میں جاتے ہوئے۔

میری زندگی کی کہانی کا وجود نہیں ہے۔ اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اس کا کوئی مرکز نہیں ہے۔ نہ ہی کوئی راستہ اور نہ ہی کوئی سیدھی لکیر۔ بہت سی ایسی جگہیں ہیں جہاں پر تاثر دیا جاتا ہے کہ کوئی شخص تھا، یہ سچ نہیں ہے، کوئی بھی شخص نہیں تھا۔ اپنی جوانی کے ایک چھوٹے سے حصے کی کہانی میں نے کم و بیش پہلے لکھی ہے، میرے کہنے کا مطلب ہے، کہ کچھ ایسے کہ اس کی کچھ جھلک سامنے آجاتی ہے، اور میں بالکل اُسی حصے کی بات کررہی ہوں، دریا کو پار کرنے والے زمانے کی، جو میں یہاں کررہی ہوں وہ مختلف ہے اور مشابہ بھی۔ پہلے، میں نے زندگی کے روشن ادوار کے بارے میں بتایا تھا، جوکہ نورانی تھے۔ یہاں میں اسی جوانی کے چھپے ادوار کے بارے میں بات کررہی ہوں، اس پردہ پوشی کی جوکہ میں نے کچھ اعمال، احساسات اور کچھ واقعات پر کی تھی۔ میں نے ایک ایسے ماحول میں لکھنا شروع کیا تھا جو مجھے شائستگی کی طرف مائل کرتا تھا۔ اُن کی نظر میں لکھنا ایک اخلاقی امر تھا۔ لکھنا، آج کل، ایسے لگتا ہے جیسے اکثر کچھ بھی نہیں ہے۔ کبھی میں یہ سمجھتی ہوں: جب لکھنا یہ نہیں ہے، سب چیزیں گڈمڈ کرنا، خود آرائی اور ہوائی باتیں کرنا، تو لکھنا کچھ بھی نہیں ہے۔ اور جب لکھنا یہ نہیں ہے، ہر مرتبہ، کسی ناقابل بیان بنیادی خصوصیت کے ذریعے تمام چیزوں کا ایک ہی چیز میں گڈمڈ ہونا، تو لکھنا کچھ نہیں ہے ماسوا اشتہار بازی کے۔ لیکن زیادہ تر میری کوئی رائے نہیں ہوتی، میں دیکھتی ہوں کہ تمام راستے کھلے ہیں، کہ کوئی دیواریں نہیں ہیں، کہ لکھائی کو

چھپنے کی کوئی جگہ نہیں ملتی، لکھے جانے کے لئے، پڑھے جانے کے لئے، کہ اس کی بنیادی نامناسبت اب ناقابل قبول ہے۔ لیکن میں اِس بارے میں مزید نہیں سوچتی۔

اب میں یہ دیکھتی ہوں کہ بہت چھوٹی عمر میں، اٹھارہ سال کی عمر میں، پندرہ سال کی عمر میں، میرا چہرہ اس چہرے کی پیشین گوئی کررہا تھا جو میں نے شراب کی وجہ سے درمیانی عمر میں اپنایا تھا۔ شراب نے وہ کردار ادا کیا جوکہ خدا نے نہیں کیا تھا، شراب نے مجھے مارنے کا کردار بھی ادا کیا، مارنے کا۔ یہ شرابی چہرہ مجھے شراب سے پہلے ہی مل گیا تھا۔ شراب صرف اس کی تصدیق کے لئے آئی تھی۔ میرے اندر اس کے لئے جگہ تھی، دوسروں کی طرح میں بھی یہ جان گئی تھی، لیکن، حیرت ہے، وقت سے پہلے ہی۔ بالکل اسی طرح جیسے میرے اندر خواہش کے لئے جگہ تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں میرا چہرہ لذت والا تھا اور میں لذت سے ناآشنا تھی۔ یہ چہرہ بہت نمایاں تھا۔ میری ماں نے بھی اسے ضرور دیکھا ہوگا۔ میرے بھائیوں کو وہ نظر آتا تھا۔ میرے لئے سب کچھ اس طریقہ سے شروع ہوا، اس نمایاں، بجھے ہوئے چہرے، آنکھوں کے گرد حلقے، وقت اور تجربہ سے پہلے۔

ساڑھے پندرہ سال۔ ہم دریا پار کر رہے ہیں۔ جب میں سائیگون واپس جاتی ہوں تو مجھے سفر کا احساس ہوتا ہے، خصوصاً اُس وقت جب میں بس

میں سفر کرتی ہوں۔ اُس دن صبح ، میں نے بس سادیک میں پکڑی جہاں میری ماں لڑکیوں کے ایک سکول کی سربراہ ہے۔ سکول کی چھٹیاں ختم ہو چکی ہیں لیکن اب مجھے یاد نہیں کون سی چھٹیاں۔ میں نے اُنہیں ماں کو سکول کی طرف سے دیے گئے چھوٹے سے مکان میں گزارا تھا۔اُور اُس دن ، میں سائیگون، اپنے بورڈنگ سکول میں واپس جا رہی ہوں۔ مقامی لوگوں کے لیے بس سادیک کے منڈی والے چوک سے روانہ ہوئی۔ معمول کے مطابق ، ماں اڈے تک میرے ساتھ آئی اور اُس نے مجھے بس کے ڈرائیور کے سپرد کیا، وہ ہمیشہ مجھے سائیگون کی بسوں کے ڈرائیورں کے سپرد کرتی ہے،تاکہ وہ کسی حادثہ ، آگ، آبرو ریزی، بحری ڈاکہ زنی، یا کشتی میں کسی مہلک سانحہ کی صورت میں میرا خیال رکھیں۔ اور معمول کے مطابق بس ڈرائیور نے مجھے اپنے ساتھ والی اپنی اگلی سیٹ پر بٹھایا، جو گورے لوگوں کے لیے مخصوص ہے۔

یہی وہ سفر تھا جس کے دوران گویا وہ تصویر علیحدہ ہوگئی، کہ وہ باقی تمام تصویروں سے جدا ہوگئی۔ اس تصویر کا وجود ہوسکتا تھا، ایک فوٹو گراف کھینچا جاسکتا تھا، کسی بھی دوسرے فوٹو گراف کی طرح، کسی اور جگہ، دوسرے حالات میں۔ لیکن وہ فوٹو گراف نہیں لیا گیا۔ اس کا موضوع بہت ادنیٰ تھا۔ اس کے بارے میں سوچ بھی کون سکتا تھا۔ یہ فوٹو گراف صرف اس صورت میں لیا جاتا اگر کسی کو میری زندگی میں اس واقعہ کی اہمیت کا پہلے ہی سے علم ہوتا، دریا کو پار کرنے والے واقعہ کا، لیکن جب یہ واقعہ پیش آ رہا تھا، کسی کو اس کے وجود کا

بھی علم نہیں تھا۔ صرف خدا ہی جانتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تصویر وجود میں نہیں ہے اور اس کے علاوہ ہو بھی کیا سکتا تھا، اس کا وجود نہیں ہے۔ اس کو چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس کو فراموش کر دیا گیا تھا۔ اس کو علیحدہ نہیں کیا گیا، اس کو دوسروں سے جدا نہیں کیا گیا۔ اور یہی اس کی خوبی ہے کہ یہ تصویر نہیں لی گئی تھی: کہ یہ کسی مطلق کی نمائندگی کرتی ہے، خود اپنی ہی تخلیق کار ہوتی ہے۔

تو یہ واقعہ دریائے میکونگ کی ایک شاخ کو پار کرتے ہوئے پیش آیا، وِن لونگ اور سادیک کے درمیان چلنے والی کشتی پر، جنوبی کوچن چین کے کیچڑ اور چاولوں کے بڑے میدان میں، پرندوں کا میدان۔

میں بس سے اترتی ہوں۔ میں جنگلے کی طرف جاتی ہوں۔ میں دریا کی طرف دیکھتی ہوں۔ میری ماں کبھی کبھی مجھے کہتی ہے کہ مجھے اپنی تمام زندگی میں اتنے خوبصورت، اتنے بڑے، اتنے جنگلی دریا کہیں دوسری جگہ دکھائی نہیں دیں گے، میکونگ اور اس کے معاون دریا سمندر کی طرف بہتے ہوئے، پانی کے بڑے بڑے خطے جو سمندر کے غاروں میں غائب ہوجاتے ہیں۔ حد نظر تک پھیلے ہموار میدانوں میں یہ دریا تیزی سے بہتے ہیں، اتنی تیزی سے کہ یوں لگتا ہے کہ زمین نیچے ڈھل رہی ہے۔

جب ہم کشتی پر پہنچتے ہیں تو میں ہمیشہ بس سے نیچے اتر آتی ہوں، رات کے وقت بھی، کیونکہ مجھے ہمیشہ ڈر سا لگا رہتا ہے، مجھے ڈر ہوتا ہے کہ کہیں رسے ٹوٹ نہ جائیں، کہ کہیں ہم پانی کی لہروں کے ساتھ سمندر کی طرف نہ بہہ جائیں۔ خطرناک لہروں میں، میں اپنی زندگی کا آخری لمحہ دیکھتی ہوں۔ لہریں اتنی تیز اور تُند ہوتی ہیں کہ وہ ہر شے کو اپنے ساتھ بہا سکتی ہیں، چٹانوں کو بھی ، ایک کلیسہ بھی ، ایک شہر بھی۔ دریا کے پانی کے اندر ایک طوفان اُبل رہا ہوتا ہے۔طوفانی ہوائیں چلتی ہیں۔

میں نے خالص ریشم کا فراک پہنا ہوا ہے، فراک چیتھڑے ہو چکا ہے،اتنا باریک کہ جسم کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے ۔ پہلے یہ میری ماں کا فراک تھا، ایک دن اُس نے اسے پہننا چھوڑ دیا کیونکہ اُس کے خیال میں اس کا رنگ بہت شوخ تھا، اور اُس نے مجھے دے دیا۔ اس فراک کے آستین نہیں ہیں اور اس کا گلہ نیچے تک کٹا ہوا ہے۔ اس کا رنگ بھورا ہو چکا ہے جیسے کہ بہت استعمال شدہ خالص ریشمی کپڑے کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا فراک ہے جو مجھے ابھی تک یاد ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ یہ مجھے بہت سجتا ہے۔ میں نے کمر پر چمڑے کی پیٹی باندھی ہوئی ہے، شاید یہ پیٹی میرے بھائیوں کی تھی۔ اب مجھے یہ یادنہیں کہ میں اُس زمانے میں کس قسم کے جوتے پہنتی تھی، مجھے صرف کچھ کپڑے ہی یاد ہیں۔ زیادہ تر میں جرابوں کے بغیر ہی کرپچ کے

سینڈل پہنتی ہوں۔ میں یہ سائیگون کے ہائی سکول کے زمانہ کی بات کررہی ہوں۔ اس کے بعد تو میں ہمیشہ جوتے پہنتی تھی۔ اس دن میں نے یقیناً وہ نہایت عمدہ اونچی ایڑی والے طلے کے جوتے پہنے ہوئے تھے۔ چونکہ مجھے کوئی اور ایسے جوتے دکھائی نہیں دیئے جو میں اس دن پہن سکتی، تو میں نے انہیں پہن لیا۔ میری ماں نے انہیں میرے لئے سستے سے سستے داموں میں سیل میں خریدا تھا۔ میں یہ طلے والے جوتے پہن کے سکول جاتی ہوں۔ میں سکول، شام کو پارٹیوں میں پہنے جانے والے یہ جوتے پہن کے جاتی ہوں جن میں مصنوعی ہیروں کے مسالے کے گل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ یہ میری اپنی مرضی ہے۔ مجھے صرف یہی جوتے اچھے لگتے ہیں اور اب بھی مجھے یہی پسند ہیں۔ یہی میری زندگی کے پہلے اونچی ایڑیوں والے جوتے تھے، یہ بہت خوبصورت ہیں، اور انہوں نے باقی تمام جوتوں کو ماند کردیا ہے جو میں پہلے پہنتی تھی، جوکہ کھیلنے اور بھاگنے دوڑنے والے، بغیر ایڑی کے جوتے تھے، اور جو سفید کپڑے کے بنے ہوئے تھے۔

اس دن جو چیز چھوٹی لڑکی کی وضع قطع میں عجیب وغریب اور انوکھی ہے، وہ یہ جوتے نہیں ہیں۔ اس دن جو چیز خاص ہے وہ یہ ہے کہ لڑکی نے سر پر مردانہ ہیٹ پہنا ہوا ہے جس کے کنارے چپٹے ہیں اور جو نرم نمدے کا بنا ہوا ہے، جس کا رنگ بھورا سا ہے اور جس میں ایک کالے رنگ کا چوڑا ریشمی فیتہ

لگا ہوا ہے۔

تصویر کا فیصلہ کن ابہام، اس ہیٹ میں ہے۔

مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں کہ یہ ہیٹ میرے پاس کہاں سے آیا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مجھے یہ کس نے دیا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اسے میری ماں نے خریدا ہوگا اور وہ بھی میرے کہنے پر۔ ایک ہی بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ سستے سے سستے داموں میں خریدا گیا ہوگا۔ اس خریداری کی کیسے وضاحت کی جائے؟ کوئی بھی عورت، کوئی بھی نوجوان لڑکی اس زمانے میں اس کالونی میں ماہوت کا مردانہ ہیٹ سر پر نہیں پہنتی تھی اور نہ ہی کوئی مقامی عورت۔ میرے خیال میں ہوا یہ ہوگا کہ میں نے اس ماہوتی ہیٹ کو محض امتحان کے طور پر، یونہی مذاقاً سر پر رکھا ہوگا اور پھر میں نے اپنے آپ پر دکان کے آئینہ میں نگاہ ڈالی ہوگی اور پھر میں نے دیکھا ہوگا: ایک مردانہ ہیٹ کے نیچے پتلے بے ڈھب سے جسم کی شکل، بچپن کا یہ نقص کسی اور ہی چیز میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اب یہ قدرت کی ایک ناآسودہ اور ناگزیر حقیقت نہیں رہی بلکہ اس کے برعکس اُس حقیقت کے خلاف ایک انتخاب بن گیا تھا، ایک سوچا سمجھا اور ناگہانی انتخاب۔ اور یکدم اسے لینے کی خواہش پیدا ہوگئی۔ یکدم میں اپنے آپ کو کسی اور شخص میں تبدیل شدہ دیکھتی ہوں، جیسے کہ کوئی دوسرا شخص دیکھا جاتا ہے، اپنے آپ سے باہر، جو کہ دوسروں کے لئے موجود ہے،

جو دوسرے لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنتا ہے، شہروں میں، شاہراہوں پر، خواہش میں۔ میں ہیٹ کو لے لیتی ہوں اور اس کے بعد اُس سے کبھی جدا نہیں ہوتی۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو مجھے مکمل بنا دیتی ہے۔ میں اس کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتی۔ جوتوں کے بارے میں تقریباً ایسے ہی ہوگا لیکن ہیٹ کے بعد۔ جوتے ہیٹ کی تردید کرتے ہیں، جیسے کہ ہیٹ نحیف جسم کی تردید کرتا ہے، اس لئے یہ جوتے میرے لئے بہت اچھے ہیں۔ میں ان کو بھی ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی ہوں، میں ان جوتوں میں ہی ہر جگہ جاتی ہوں، اور اس ہیٹ کے ساتھ، باہر، ہر موسم میں، ہر موقعہ پر، میں شہر جاتی ہوں۔

مجھے اپنے بیٹے کی ایک تصویر ملی ہے جب وہ بیس سال کا تھا۔ وہ کیلی فورنیا میں اپنی دوستوں اریکا اور الیزابت لینار کے ساتھ ہے۔ وہ دبلا پتلا ہے، اتنا دبلا کہ یوں لگتا ہے کہ وہ بھی ایک یوگینڈا کا رہنے والا ایک سفید فام ہے۔ میری نظر میں اس کی مسکراہٹ متکبرانہ ہے، کچھ ایسے کہ وہ اپنا مذاق اڑا رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک آوارہ نوجوان کا تاثر دینا چاہتا ہے۔ وہ اس حالت میں خوش ہے، بے نوا، چہرہ بے نوا، ایک نحیف نوجوان کا انداز، یہ تصویر اس تصویر سے سب سے زیادہ ملتی ہے جو کہ کشتی میں سوار نوجوان لڑکی کی نہیں لی گئی تھی۔

جس نے یہ گلابی رنگ والا اور چپٹے کناروں اور چوڑے کالے فیتے والا

ہیٹ خریدا تھا وہ یہ عورت ہے، ایک خاص تصویر والی عورت، یہ میری ماں ہے۔ میں اسے اس تصویر میں بہتر پہچانتی ہوں بنسبت حال میں لی گئی تصویروں کے۔ ایک ہنوئی کی چھوٹی جھیل پر واقع مکان کا صحن ہے۔ ہم سب اکھٹے ہیں، وہ اور ہم، اس کے بچے۔ میری عمر چار سال ہے۔ میری ماں تصویر کے بیچ میں کھڑی ہے۔ میں اسے آسانی سے پہچان سکتی ہوں کیونکہ وہ بے ڈھب سے انداز میں کھڑی ہے، مسکرا نہیں رہی، اور انتظار کررہی ہے کہ تصویر جلد سے جلد لی جائے۔ اس کے کھنچے ہوئے خدو خال سے، اس کے لباس کی بے ترتیبی سے اور اس کی خواب آلود نگاہوں سے میں بتاسکتی ہوں کہ گرمی بہت ہے اور یہ کہ وہ سخت تھکی ہوئی ہے اور یہ کہ وہ بیزار ہے۔ لیکن جس طریقے سے ہم نے کپڑے پہنے ہوئے ہیں، ہم نے، اس کے بچوں نے، بدقسمت بچوں کی طرح ،کہ میں اس خاص موڈ کو پہچان سکتی ہوں جس میں ہماری ماں کبھی کبھار پھنس جاتی تھی اور جس کے، تصویر والی عمر میں ہی، ہم خطرے کی علامتیں پہچانتے تھے، اُس کا وہ طریقہ کہ یکدم وہ ہمیں نہلانے سے، کپڑے پہنانے، اور کبھی کبھار کھانا کھلانے کے قابل بھی نہیں ہوتی تھی۔ زندگی کی اس شدید نااُمیدی سے میری ماں ہر روز گزرتی تھی۔ کبھی کبھی یہ کافی دیر قائم رہتا، کبھی رات پڑنے پر غائب ہوجاتا۔ میری قسمت تھی کہ میری ماں ایک خالص دل شکستگی سے اتنا دل شکستہ تھی کہ زندگی کی کوئی خوشی بھی، خواہ وہ کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو، وہ پورے طور پر اس کا دل بہلا نہیں سکتی تھی۔ جس

حقیقت سے میں ہمیشہ سے لاعلم رہی تھی وہ تھے وہ ٹھوس حقائق جن کی بناء پر وہ ہمیں اس طرح سے ہماری حالت میں چھوڑ دیتی تھی۔ اس مرتبہ، شاید یہ وہ بیوقوفانہ کام ہے جو اُس نے ابھی ابھی کیا ہے، اس گھر کو خریدنا، تصویر والا گھر، جس کی ہمیں اتنی ضرورت بھی نہیں تھی اور خریدا بھی ایسے وقت، جب میرا باپ پہلے سے ہی سخت بیمار ہے، اور وہ موت کے اتنا قریب ہے، شاید صرف چند ماہ ہی۔ یا پھر شاید اُسے بھی ابھی ابھی یہ خبر ملی ہے کہ وہ بھی اُسی بیماری میں مبتلا ہے جس سے وہ مرنے والا ہے۔ تاریخیں بھی ایک دوسری سے ملتی جلتی ہیں۔ جس چیز سے میں لاعلم ہوں، جیسے کہ یقیناً وہ بھی لاعلم ہوگی، وہ ہے اس صورت حال کی حقیقت جس کے بیچ میں سے وہ گذر رہی ہے اور جس کی وجہ سے یہ افسردگی اس کے ارد گرد منڈلاتی ہے۔ کیا یہ میرے باپ کے سر پر کھڑی موت تھی، یا دن کی ختم ہونے والی روشنی۔ اس شادی کے بارے میں سوالات، اس خاوند کے بارے میں؟ ان بچوں کے بارے میں؟ یا پھر یہ تمام چیزیں اکٹھی اور ایسا ہر روز ہوتا تھا۔ اس بات کا مجھے پوری طرح یقین ہے۔ یہ یقیناً ہولناک ہوگا۔ ہر روز کسی لمحہ بھی، یہ ناامیدی اپنی شکل دکھاتی۔ اور اس کے بعد آگے بڑھنا ناممکن ہوجاتا، یا پھر نیند، یا پھر کبھی کبھی کچھ بھی نہیں، اور یا کبھی کبھی اس کے برعکس مکانوں کی خرید، مکانوں کی تبدیلی، اور کبھی وہ ذہنی کیفیت بھی، خاص طور پر وہ ذہنی کیفیت کبھی درماندگی یا کبھی ایک ملکہ، سب کچھ ملتا جو بھی اس سے مانگا جاتا، سب کچھ جو اسے دیا جاتا، چھوٹی جھیل پر

واقع یہ مکان، کسی بھی وجہ کے بغیر، میرا باپ موت کے منہ میں، یا یہ چپٹے کناروں والا ہیٹ، کیونکہ ننھی اُسے اتنا چاہتی تھی، یا پھر یہ مطلاّ جوتے یا وغیرہ وغیرہ۔ یا کچھ بھی نہیں، یا نیند، موت۔

میں نے انڈین عورتوں والی وہ فلمیں کبھی نہیں دیکھی تھیں جن میں انہوں نے بھی ایسے ہی چپٹے کناروں والے ہیٹ پہنے ہوتے اور ان کے سینہ پر ان کی چوٹیاں ہوتیں۔ اُس دن میں نے بھی چوٹیاں کی ہوئی تھیں، میں نے اپنے بالوں کو اوپر نہیں کیا ہوا تھا جیسا کہ میری عادت ہے، لیکن وہ ویسی چوٹیاں نہیں ہیں۔ میری دو لمبی چوٹیاں ہیں جو کہ میں نے سینے پر ڈالی ہوئی ہیں جیسی فلم والی عورتوں کی ہیں جنہیں میں نے کبھی نہیں دیکھا لیکن یہ چوٹیاں ایک بچی کی ہیں۔ جب سے میرے پاس ہیٹ ہے اسے پہننے کیلئے میں اپنے بالوں کو سر پر نہیں باندھتی۔ کچھ عرصہ سے میں اپنے بالوں کو کنگھی سے زور سے کھینچتی ہوں، میں پیچھے کی طرف کنگھی کرتی ہوں، میں چاہتی ہوں کہ وہ سیدھے ہوں، کہ وہ کم دکھائی دیں۔ ہر رات میں انہیں کنگھی کرتی ہوں اور سونے سے پہلے اپنی چوٹیاں دوبارہ بناتی ہوں جیسے کہ میری ماں نے مجھے سکھایا ہے۔ میرے بال بھاری، نرم، تکلیف دہ ہیں۔ وہ سرخی مائل خاکی انبار ہیں جو کہ میری کمر تک آتے ہیں۔ لوگ اکثر کہتے ہیں کہ یہی ایک چیز ہے جو مجھ میں سب سے خوبصورت ہے اور اس کا میں یہ مطلب لیتی ہوں کہ میں خوبصورت نہیں ہوں۔ ان انوکھے بالوں کو میں بیس سال کی عمر میں پیرس میں کٹوا دیتی

ہوں، اپنی ماں کو چھوڑنے کے پانچ سال کے بعد۔ میں نے کہا: ان کو کاٹ دو۔ اس نے کاٹ دیا۔ سب کو ایک ہی وار میں۔ سرد قینچی نے میری گردن کی جلد کو چھوا۔ بال زمین پر گر گئے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ اگر میں اِنہیں رکھنا چاہوں تو وہ ان بالوں کو ایک ڈبے میں لپیٹ کے مجھے دے سکتا ہے۔ میں نے کہا نہیں۔ اس کے بعد کسی نے مجھ سے نہیں کہا کہ میرے بال خوبصورت ہیں، میرے کہنے کا مطلب ہے کہ کسی نے اس حد تک نہیں کہا، جیسے کہ وہ پہلے مجھ سے کہتے تھے، میرے انہیں کٹوانے سے پہلے۔ اس کی بجائے، بعد میں وہ کہتے: اس لڑکی کی آنکھیں خوبصورت ہیں۔ مسکراہٹ بھی بُری نہیں ہے۔

کشتی پر دیکھئے، ہنوز میرے بال ہیں۔ ساڑھے پندرہ سال۔ اور میں ابھی سے ہی بناؤ سنگھار کرتی ہوں۔ میں تو کالون کی کریم لگاتی ہوں، میں اپنے گالوں کے اوپر والے حصے پر، آنکھوں کے نیچے، پھیلے ہوئے چھائیوں کے داغ چھپانے کی کوشش کرتی ہوں۔ تو کالون کریم کے اوپر میں قدرتی گوشت کے رنگ کا پاؤڈر لگاتی ہوں، ہوبی گاں مارکہ یہ پاؤڈر میری ماں کا ہے جو اسے حکومتی تقریبات میں جانے کے وقت لگاتی ہے۔ اس دن میں نے گہرے سرخ رنگ کی سرخی لگائی ہوئی ہے، جیسے کہ اس زمانہ میں فیشن تھا، چیری رنگ کی۔ مجھے یادنہیں کہ وہ میرے پاس کہاں سے آئی، شاید اے لین

لاگو نیل نے اپنی ماں سے میرے لئے چوری کی ہو، مجھے اب یاد نہیں۔ میں نے پرفیوم نہیں لگایا ہوا، کیونکہ میری ماں کولون اور پام اولیو صابن استعمال کرتی ہے۔

کشتی پر، بس کی ایک طرف، ایک لمبی سی کالی لیموزین کھڑی ہے جس کے شوفر نے سفید سوتی وردی پہنی ہوئی ہے۔ جی ہاں، یہ میری کتابوں والی، جنازوں کے لئے استعمال ہونے والی بڑی کار ہے۔ کار 'موس لیوں بوتے' ہے کلکتہ میں فرانسیسی سفارت خانہ کی کالی کار 'لانسیا' ابھی ادب میں داخل نہیں ہوئی تھی۔

شوفروں اور کاروں کے مالکوں کے درمیان ابھی شیشہ لگا ہوا ہے جو سرکایا جاسکتا ہے۔ اور ان کاروں میں ابھی متحرک کرسیاں بھی ہیں۔ اور یہ کاریں کمرے کی طرح بڑی ہوتی ہیں۔

لیموزین میں ایک خوش وضع آدمی بیٹھا ہوا ہے جو میری طرف دیکھ رہا ہے۔ آدمی سفید فام نہیں ہے۔ اس نے یورپین انداز کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں، اور اس نے ہلکے رنگ کا ریشمی سوٹ پہنا ہوا ہے جو عام طور پر سائیگون میں بنکوں میں کام کرنے والے پہنتے ہیں۔ وہ میری طرف دیکھ رہا ہے۔

لوگوں کا میری طرف دیکھنا، اس سے میں پہلے ہی سے عادی ہوچکی ہوں۔ کالونیوں میں لوگ سفید فام عورتوں کو دیکھتے ہیں، اور بارہ سال کی چھوٹی گوری لڑکیوں کو بھی۔ پچھلے تین سالوں سے گورے آدمی بھی گلیوں کوچوں میں میری طرف دیکھتے ہیں اور میری ماں کے دوست بڑے پیار سے مجھے اپنے ہاں چائے پینے کے لئے اس وقت آنے کی دعوت دیتے ہیں جب ان کی بیویاں سپورٹس کلب میں ٹینس کھیل رہی ہوتی ہیں۔

مجھے غلطی لگ سکتی ہے، یہ سمجھتے ہوئے کہ میں دوسری خوبصورت عورتوں کی طرح خوبصورت ہوں، ان عورتوں کی طرح جن کی طرف لوگ دیکھتے ہیں، کیونکہ واقعی لوگ میری طرف بہت دیکھتے ہیں۔ لیکن میں، میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ یہ خوبصورتی کا سوال نہیں ہے بلکہ کسی اور چیز کا، مثلاً، ہاں، کسی اور چیز کا، مثلاً ذہن کا۔ جو کچھ میں دکھائی دینا چاہتی ہوں، میں دکھائی دیتی ہوں،خوبصورت بھی اگر لوگ یہی چاہتے ہیں کہ میں خوبصورت لگوں، یا حسین، حسین مثال کے طور پر اپنے خاندان کے لئے، اس سے زیادہ نہیں، میں وہ سب کچھ بن سکتی ہوں جس کی لوگ مجھ سے توقع رکھتے ہیں۔ اور اس پر یقین بھی کرسکتی ہوں۔ یہ بھی یقین کہ میں دل رُبا بھی ہوں۔ اور ٹھیک اس لمحے سے جب میں یہ یقین کرتی ہوں، کہ یہ بات اُس کے لئے بھی ایسے ہی ہوجائے جو میری طرف دیکھ رہا ہے اور جس کی خواہش ہے کہ میں اس کی پسند

کے مطابق ہوجاؤں، تو میں یہ بھی کرسکتی ہوں۔ یوں میں جان بوجھ کے دل رُبا بھی ہوسکتی ہوں اگرچہ میرے بھائی کا قتل میرے ارد گرد منڈلا رہا ہے۔ اور موت کے لئے صرف ایک ہی شریک جرم ہے، میری ماں۔ میں دل رُبا کا لفظ یوں استعمال کررہی ہوں جیسے کہ اسے میرے ارد گرد استعمال کیا جاتا تھا، بچوں کے ارد گرد۔

اب تو میں ہوشیار ہوچکی ہوں۔ اب تو میں تھوڑا بہت جانتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ نہ تو یہ لباس ہے جو عورتوں کو کم اور زیادہ خوبصورت بناتا ہے اور نہ ہی بناؤ سنگھار، اور نہ ہی کریموں کی قیمتیں، اور نہ ہی سنگھار کے سامان کی نایابی، نہ ان کی قیمت۔ میں جانتی ہوں کہ مسئلہ کچھ اور ہے۔ میں یہ نہیں جانتی کہ وہ کیا مسئلہ ہے۔ میں صرف یہ جانتی ہوں کہ مسئلہ وہ نہیں ہے جسے عورتیں سمجھتی ہیں۔ میں سائیگون کی گلیوں کوچوں میں عورتوں کو دیکھتی ہوں، اور اندرون ملک کے دور دراز علاقوں میں بھی۔ ان میں سے کئی بہت خوبصورت بھی ہیں، بہت گوری بھی، یہاں عورتیں اپنی خوبصورتی کا بہت خیال رکھتی ہیں، خاص طور پر اندرونِ ملک دور دراز علاقوں میں۔ وہ کوئی کام نہیں کرتیں، وہ صرف اپنے آپ کو سنبھال کر رکھتی ہیں، وہ اپنے آپ کو یورپ کے لئے سنبھال کر رکھتی ہیں، عاشقوں کے لئے، اٹلی میں چھٹیاں گزارنے کے لئے، ہر تین سال بعد چھ مہینے کی لمبی چھٹیاں جب وہ بالآخر باتیں کرسکیں گی کہ

یہاں کیا حالات ہیں، اس انوکھی کالونی میں، زندگی کے بارے میں، یہاں کی سہولتوں کے بارے میں، اِن نوکروں کے بارے میں جو اتنے مستعد ہیں، یہاں کے سبزے کے بارے میں، یہاں کے اجتماعی رقصوں کے بارے میں، ان سفید بنگلوں کے بارے میں جو اتنے وسیع ہیں کہ انسان وہاں آسانی سے کھوسکتا ہے، اور جن میں دور دراز آسامیوں پر لگے ہوئے حکومت کے افسران رہتے ہیں۔ یہ عورتیں انتظار کرتی ہیں۔ وہ بغیر کسی مقصد کے اچھے اچھے لباس پہنتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو دیکھتی ہیں۔ ان بنگلوں کی چھاؤں میں وہ اپنے آپ کو بعد کے لئے دیکھتی ہیں، وہ سمجھتی ہیں کہ وہ ایک رومان کی زندگی بسر کررہی ہیں، ان کے پاس پہلے ہی سے لمبی لمبی الماریاں ہیں جو کپڑوں سے اتنی بھری ہوئی ہیں کہ انہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ان کا کیا کریں، کپڑے جو انہوں نے وقت کی طرح ایک ایک کرکے جمع کیے ہوئے ہیں، انتظار کے دنوں کی ایک لمبی کڑی۔ ان میں سے کچھ عورتیں پاگل ہوجاتی ہیں۔ کچھ چھوڑ دی جاتی ہیں کسی نوجوان نوکرانی کے لئے جو اپنا منہ بند رکھتی ہے۔ چھوڑی ہوئی، یہ لفظ ان کو ضرب لگاتا سنائی دیتا ہے، اور اس کا شور، اس تھپڑ کا شور جو یہ لفظ رسید کرتا ہے۔ ان میں سے کچھ خودکشی کرلیتی ہیں۔

میری نظر میں عورتوں کا اپنے آپ سے کیا ہوا یہ فریب ایک غلطی ہے۔

خواہش کو ترغیب دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ یا تو اس عورت میں ہوتی ہے جو یہ خواہش بھڑکاتی ہے یا پھر وہ سرے سے ہوتی ہی نہیں۔ یا تو

وہ پہلی ہی نظر میں موجود ہوتی تھی یا پھر وہ کبھی بھی موجود نہیں تھی۔ یا تو وہ جنسی تعلقات کا فوری طور پر آنے والا علم ہوتا ہے یا پھر وہ کچھ بھی نہیں۔ اس بات کا بھی مجھے اس تجربہ سے سابقہ پڑنے سے پہلے ہی علم تھا۔

صرف ایلین لاگونل ہی تھی جو کہ غلطی والے قانون سے محفوظ تھی، وہ بچپن میں ہی اٹکی رہ گئی تھی۔

بہت عرصے تک میرے پاس اپنے کپڑے ہی نہیں تھے۔ میرے کپڑے ایک قسم کی بوری جیسے ہیں، وہ میری ماں کے پرانے کپڑوں سے بنے ہوئے ہیں جو کہ خود بوری جیسے ہیں۔ ان کے علاوہ جو میری ماں نے دوٓ سے سلوائے تھے۔ وہ ہماری گھر کی منتظم ہے جس نے میری ماں کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑا، اس وقت بھی جب اسے فرانس واپس جانا پڑا، اس وقت بھی جب میرے بڑے بھائی نے سادیگ میں سرکاری گھر میں اس سے زبردستی کرنے کی کوشش کی تھی، اس وقت بھی جب اُسے تنخواہ ملنی بند ہوگئی تھی۔ دوٓ کی پرورش راہبہ عورتوں نے کی تھی اور وہ کڑھائی کرنا جانتی ہے اور چنٹیں بنانا جانتی ہے، وہ ہاتھوں سے ایسے سیتی ہے جیسے ہاتھوں سے سینا صدیوں سے ختم ہو چکا ہے، بالوں کی طرح پتلی سوئیوں کے ساتھ۔ کیونکہ وہ کڑھائی کرنا جانتی ہے میری ماں اسی سے چادریں کڑھواتی ہے۔ کیونکہ وہ چنٹیں بنانا جانتی ہے ماں اس

سے میرے لئے چنٹوں والے کپڑے سلواتی ہے، جھالروں والے کپڑے، میں انہیں بوری کی طرح پہنتی ہوں، وہ اب فیشن میں نہیں ہیں، ہمیشہ بچوں جیسے، سامنے کی طرف چنٹوں کی دو قطاریں اور کالودین کالر، الیڑھی ہوئی سکرٹ، یا اُریب میں کٹی پٹیاں، فیشنی سلائی دکھانے کو۔ میں ان کپڑوں کو بیلٹ لگا کے بوری کی طرح پہنتی ہوں جس سے ان کی شکل بگڑ جاتی ہے اور وہ دائمی بن جاتے ہیں۔

عمر ساڑھے پندرہ سال۔ بدن پتلا ہے، تقریباً لاغر، چھاتیاں ابھی ایک بچی کی ہیں، اور سنگھار ہلکا گلابی اور سرخ اور پھر وہ لباس جو لوگوں کو ہنسنے پر مجبور کردے لیکن جسے دیکھ کر کوئی نہیں ہنستا۔ میں جانتی ہوں کہ سب کچھ موجود ہے۔ سب کچھ ہے اور ابھی تک بازی نہیں لگی، مجھے وہ آنکھوں میں دکھائی دیتا ہے، سب کچھ ابھی سے آنکھوں میں موجود ہے۔ میں لکھنا چاہتی ہوں۔ میں نے پہلے ہی اپنی ماں سے کہا: جو کہ میں چاہتی ہوں، وہ یہی ہے، لکھنا۔ پہلی دفعہ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر وہ پوچھتی ہے: لکھنا کیا؟ میں کہتی ہوں کہ کتابیں، ناول۔ وہ سختی سے کہتی ہے: ریاضی کی ڈگری کا امتحان پاس کرنے کے بعد اگر تم چاہو تو لکھ سکتی ہو، لیکن میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ وہ اس کے خلاف ہے، یہ کام شایانِ شان نہیں ہے، یہ کوئی کام تو نہیں ہے، یہ ایک مذاق ہے۔ وہ بعد میں مجھے کہے گی: ایک بچے کا خیال۔

ماہوت ہیٹ والی لڑکی دریا کی دھندلی روشنی میں کھڑی ہے، اکیلی کشتی

کے عرشہ پر، جنگلے پر کہنیوں سے ٹیک لگائے۔آدمیوں کا ہیٹ پورے منظر کو
گلابی رنگ دے رہا ہے۔ یہی رنگ ہے ہر طرف۔ دریا پر پڑتا ہوا دھندلا
سورج، گرمیوں کے موسم والا سورج، دریا کے کنارے چھپ گئے ہیں اور یوں
لگتا ہے جیسے کہ سمندر افق کے ساتھ مل گیا ہو۔ دریا کا پانی بے آواز بہہ رہا
ہے، کوئی شور نہیں ہے، جسم میں خون، پانی کے باہر ہوا بالکل ساکن ہے۔
پورے منظر میں صرف کشتی کے انجن کا شور ہے، جو ایک پرانا ٹوٹا پھوٹا انجن
ہے جس کی کمانیں جل چکی ہیں۔ کبھی کبھی، ہوا کے ہلکے جھونکوں سے، مختلف
آوازوں کا شور سنائی دیتا ہے۔ اور پھر کتوں کے بھونکنے کی آوازیں، وہ ہر
طرف سے آ رہی ہیں، دھند کے پیچھے سے، تمام گاؤں سے۔ لڑکی کشتی بان کو
بچپن سے ہی جانتی ہے۔ کشتی والا اسے دیکھ کر مسکراتا ہے اور اس سے مادام
پریسیل کے حال کے بارے میں پوچھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ انہیں اکثر رات
کو دیکھتا ہے، جب وہ اپنی کمبوڈیا والی جائداد کو دیکھنے جاتی ہیں۔ ماں خیریت
سے ہے، لڑکی کہتی ہے۔ کشتی کے ارد گرد دریا، بریز، اس کا تیز چلتا ہوا پانی
چاولوں کے کھیتوں میں کھڑے پانی میں سے گزر رہا ہے، اور یہ دو پانی آپس
میں نہیں ملتے۔ دریا نے تونلے ساپ، کمبوڈیا کے جنگل سے، سب کچھ اکٹھا
کرلیا ہے جو اس کے راستے میں آیا۔ وہ اپنے ساتھ سب کچھ لا رہا ہے،
بھوسے کی جھگیاں، جنگل کے جنگل، بجھی ہوئی آگ، مردہ پرندے، مردہ کتے،
شیر، بھینسے، ڈوبے ہوئے، ڈوبے ہوئے انسان، چارہ، آپس میں جڑے

ہوئے سنبل کے جزیرے، یہ سب کچھ سمندر اوقیانوس کی طرف رواں ہے، کسی چیز کے پاس ڈوبنے کا بھی وقت نہیں، سب کچھ اندرونی بہاؤ کے گہرے اور گردش کرتے ہوئے طوفان کے ساتھ بہہ رہا ہے، سب کچھ دریا کے زور کی وجہ سے پانی کی سطح پر ہی ٹھہرا ہوا ہے۔

میں نے اسے جواب دیا کہ جس چیز کی مجھے کسی دوسری چیز سے بھی زیادہ خواہش ہے وہ ہے لکھنا، اس کے علاوہ کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔ حاسد ہے وہ۔ کوئی جواب نہیں، بس ایک سرسری سی نگاہ جوکہ فوراً ہٹالی گئی، کندھوں کی ایک ہلکی سی جنبش، نہ بھولنے والی۔ میں وہاں سے سب سے پہلے نکلوں گی، ابھی کچھ سال مزید انتظار کرنا پڑے گا کہ وہ مجھے کھوئے، کہ وہ اِس لڑکی کو کھوئے، اس بچی کو۔ جہاں تک بیٹوں کا سوال ہے کسی قسم کے خوف کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس لڑکی نے، وہ جانتی تھی، کہ اس نے گھر چھوڑ دینا ہے کہ وہ یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجائے گی۔ فرانسیسی زبان میں کلاس میں اول۔ ہیڈماسٹر اس سے کہتا ہے: آپ کی بیٹی، مادام، فرانسیسی میں اوّل ہے۔ میری ماں کچھ نہیں کہتی، کچھ بھی نہیں، وہ خوش نہیں کیونکہ یہ اس کے بیٹے نہیں جو فرانسیسی میں اول ہیں، کمینی، میری ماں، میری محبت، وہ پوچھتی ہے: اور ریاضی میں؟ اسے جواب ملتا ہے: ابھی تک تو اتنی اچھی نہیں ہے، لیکن بعد میں ٹھیک ہوجائے گی۔ میری ماں پوچھتی ہے: کب ٹھیک ہوگی؟ اسے جواب ملتا ہے: جب وہ یہ چاہے گی، مادام۔

میری ماں میری محبت، اُس کا ناقابل یقین بھدا پن، اپنے سوتی موزوں کے ساتھ جنہیں دو نے رفو کیا ہوا ہے، منطقہ حارّہ میں رہتے ہوئے بھی اس کا عقیدہ ہے کہ سکول کی ہیڈمسٹریس ہونے کے ناطے ضروری ہے کہ موزے پہنے جائیں، اس کے بے شکل، خراب جنہیں دو ہی ٹھیک کرتی ہے، وہ سیدھے اپنے پیکارڈی کے آبائی فارم سے یہاں آئی ہے، جہاں خالہ زاد بہنوں کی بھرمار ہے، وہ سب کچھ اس وقت تک استعمال کرتی ہے جب تک وہ ختم نہ ہوجائیں، اوراس کا عقیدہ ہے کہ یہ ضروری ہے، ضروری ہے کہ بندہ کسی چیز کا مستحق ہو، اس کے جوتے، اس کے جوتوں کی ایڑیاں گھس چکی ہیں، وہ بے ڈھنگی چال چلتی ہے، تکلیف کے ساتھ، اس نے اپنے بال اکٹھے کرکے پیچھے لے جاکر چینی طرز کی چوٹی میں کس کے باندھے ہوئے ہیں، اُس کی وجہ سے ہمیں شرم آتی ہے، اس کی وجہ سے مجھے لیسے کے سامنے سڑک پر کھڑے ہونے میں شرم آتی ہے، جب وہ اپنی کار میں لیسے کے سامنے آتی ہے تو تمام لوگ اس کی طرف دیکھتے ہیں، لیکن اُسے، اُسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا، کبھی بھی نہیں، اسے تو بند کردینا چاہیئے، مارنا پیٹنا چاہیئے، مار دینا چاہیئے۔ وہ میری طرف دیکھتی ہے، وہ کہتی ہے: شاید تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔ دن ہو یا رات، بس یہی خبط۔ بات یہ نہیں ہوتی کہ بندہ کچھ حاصل کرے، بات ہوتی ہے کہ بندہ وہاں سے نکلے جہاں پر وہ ہے۔

جب میری ماں دوبارہ نمودار ہوتی ہے، جب وہ ناامیدی سے باہر نکلتی ہے، اس کی نظر مردانہ ہیٹ اور طلّے والے جوتوں پر پڑتی ہے۔ وہ مجھ سے پوچھتی ہے کہ یہ کیا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ کچھ نہیں۔ وہ میری طرف دیکھتی ہے، اسے یہ پسند آتے ہیں، وہ مسکراتی ہے۔ یہ اتنے خراب نہیں، وہ کہتی ہے، تم پر یہ اتنے بُرے نہیں لگتے، یہ اچھی تبدیلی ہے۔ وہ نہیں پوچھتی کہ کیا یہ اس نے خریدے تھے، وہ جانتی ہے کہ اسی نے خریدے تھے۔ وہ جانتی ہے کہ وہ اس قابل ہے، کہ کچھ موقعوں پر، جیسے کہ میں نے ان موقعوں کے بارے میں بتایا ہے، اس سے اپنی خواہش کے مطابق کچھ بھی بٹورا جاسکتا ہے، وہ ہمیں کسی چیز کا بھی انکار نہیں کرتی۔ میں کہتی ہوں: یہ قطعی مہنگا نہیں ہے، فکر نہ کرو۔ وہ پوچھتی ہے کہ یہ کہاں سے لئے۔ میں کہتی ہوں کہ یہ کاتنا روڈ سے لئے گئے ہیں، سستی کی ہوئی چیزوں پر مزید رعایت پہ۔ وہ میری طرف ہمدردانہ انداز سے دیکھتی ہے۔ وہ یقیناً سوچتی ہوگی کہ یہ شگون اچھا ہے، اس بچی کا تخیل، اس طریقہ سے کپڑے پہننے کی ایجاد۔ صرف یہ نہیں کہ وہ اس مسخرہ پن کو قبول کرلیتی ہے، اس ناشائستگی کو، وہ جو کہ ایک بیوہ کی طرح سنجیدہ ہے، اور جس کے گہرے رنگ کے کپڑے ایک بے چوغہ راہبہ کی طرح ہیں، بلکہ اسے یہ ناشائستگی پسند آتی ہے۔

اس مردانہ ہیٹ کا غربت کے ساتھ بھی تعلق ہے کیونکہ یہ ضروری ہے کہ گھر میں کہیں سے پیسہ بھی آئے، کسی نہ کسی طریقہ سے ضروری تو ہے ہی۔

اس کے چاروں طرف صحرا ہی صحرا ہیں، بیٹے بھی صحرا ہیں، وہ کچھ بھی نہیں کریں گے، اور شورے والی زمینیں بھی، پیسے ہمیشہ کے لئے ضائع، سب کچھ ختم۔ باقی کچھ رہ گیا ہے تو یہ چھوٹی لڑکی جوکہ بڑی ہورہی ہے، اور جو شاید ایک دن جان جائے کہ اس گھر میں پیسہ کیسے لایا جاسکتا ہے۔ اسی وجہ سے، لڑکی نہیں جانتی، ماں اپنی بچی کو طوائف بچی کے کپڑوں میں باہر جانے کی اجازت دیتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بچی کو ابھی سے ایسے طریقے آتے ہیں کہ لوگ جو توجہ بچی کو دیتے ہیں، وہ، اس کے بدلے میں وہ پیسوں میں دلچسپی لیتی ہے۔ ماں اس خیال سے مسکراتی ہے۔

ماں اس کو روکے گی نہیں جب وہ پیسہ بنانے کی کوشش کرے گی۔ بچی کہے گی: میں نے اس سے پانچ سو پیاستر واپس فرانس جانے کے لئے مانگے۔ ماں جواب دے گی کہ یہ ٹھیک ہے، ہمیں اتنا ہی چاہیئے ہوگا پیرس میں رہنے کے لئے، اور وہ کہے گی: پانچ سو پیاستر سے کام چل جائے گا۔ بچی جانتی ہے کہ جو کچھ وہ کررہی ہے، خود، وہی چیز ماں چاہے گی کہ اس کی بچی کرے، اگر اس میں ہمت ہو۔۔۔۔۔، اگر اس میں اتنی طاقت ہو، اگر اس کے خیالات کا درد روزانہ وہاں نہ ہوتا، اور جو اس کو عاجز نہ کردیتا۔

ان کتابوں میں جو میں نے اپنے بچپن کے زمانے کے بارے میں لکھیں ہیں، یکدم مجھے یاد نہیں آرہا کہ میں نے کیا کہنے سے گریز کیا ہے، اور میں نے کیا کہا ہے، میرا خیال ہے میں نے ماں کیلئے ہماری محبت کے

بارے میں لکھا ہے، لیکن مجھے معلوم نہیں، آیا میں نے ماں کے لئے ہماری نفرت کے بارے میں بھی لکھا ہے، اور وہ محبت جو ہم ایک دوسرے کے لئے رکھتے تھے، اور نفرت بھی، شدید، اس خاندان کی تباہی اور موت کی مشترکہ کہانی جو ہمیشہ اس خاندان کی تھی، محبت بھی، نفرت بھی، اور جو اب تک میری سمجھ سے باہر ہے اور جو میرے لئے اب تک ناقابل رسائی ہے، میرے وجود کی گہرائیوں میں پوشیدہ، نئے نئے پیدا ہونے والے بچے کے پہلے دن کی طرح اندھی۔ وہ ایسی جگہ ہے جس کی دہلیز پر خاموشی شروع ہوجاتی ہے۔ جو کچھ وہاں وقوع پذیر ہوتا ہے وہ یہی خاموشی ہے، میری پوری زندگی میں آہستہ آہستہ چلنے والاایک بوجھ۔ میں ابھی تک ان مجنون بچوں کے سامنے ہوں، اس معمہ سے اتنی ہی دور۔ میں نے کبھی اس بارے میں نہیں لکھا، یہ سمجھتے ہوئے کہ میں نے لکھا ہے، میں نے کبھی محبت نہیں کی، یہ سمجھتے ہوئے کہ میں نے محبت کی، اور میں نے ایک بند دروازے کے سامنے انتظار کرنے کے علاوہ کبھی کچھ نہیں کیا۔

جب میں میلونگ والی کشتی پر سوار ہوں، کالی لیموزین والے دن، میری ماں نے بیراج والی زمین کو ابھی تک نہیں چھوڑا تھا۔ اب بھی ہم کبھی کبھار وہاں جاتے ہیں، پہلے کی طرح، رات کو، ہم تینوں وہاں جاتے ہیں، کچھ دن گذارنے کے لئے۔ وہاں ہم بنگلے کے ورانڈے میں بیٹھتے ہیں، سیام کے پہاڑوں کے سامنے۔ اور پھر ہم وہاں سے واپس چلے جاتے ہیں۔ وہاں اسے

کوئی کام نہیں ہے لیکن وہ پھر بھی وہاں جاتی ہے۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی اس کے ساتھ ورانڈے میں ہیں، جنگل کے سامنے۔ اب ہم بڑے ہوگئے ہیں، اب ہم دریا میں تیرتے نہیں، اب ہم دریا کے دہانے میں دلدل میں کالے چیتوں کا شکار کرنے نہیں جاتے اور نہ ہی ہم جنگل میں جاتے ہیں اور نہ ہی گاؤں میں مرچوں کے باغات میں۔ ہمارے ارد گرد سب کچھ بڑا ہوگیا ہے۔ اب نہ تو بھینسوں کے اوپر بچے بیٹھے ہیں اور نہ ہی کسی اور چیز کے اوپر۔ ہم بھی اجنبیت کا شکار ہوچکے ہیں اور وہی کاہلی جو ماں کے اوپر طاری ہے وہ اب ہم تک بھی پہنچ گئی ہے۔ ہم نے کچھ نہیں سیکھا، جنگل کو دیکھتے ہوئے، انتظار کرتے ہوئے، روتے ہوئے۔ نیچے والی زمین تو ہمیشہ کے لئے کھو گئی ہے، نوکر اوپر والی زمین کے کچھ حصوں میں کاشت کرتے ہیں، ہم ان کیلئے دھان چھوڑ دیتے ہیں، وہ وہاں تنخواہ کے بغیر رہتے ہیں، وہ توڑی کی بنی ہوئی مضبوط جھگیوں کو استعمال کرتے ہیں جنہیں ماں نے بنوایا تھا۔ وہ ہم سے ایسے محبت کرتے ہیں جیسے ہم ان کے خاندان کے فرد ہوں، وہ ایسے کام کرتے ہیں جیسے کہ وہ بنگلے کی رکھوالی کررہے ہوں اور وہ واقعی کرتے ہیں۔ ہماری سستی کراکری کا کوئی برتن غائب نہیں ہے۔ بارشوں کی وجہ سے ٹوٹی اور گلی ہوئی چھت آہستہ آہستہ تباہ ہورہی ہے۔ لیکن فرنیچر کو پالش کیا جاتا ہے۔ اور بنگلے کی شکل ویسے ہی صاف شفاف ہے جیسے کہ کوئی تصویر، سڑک سے دکھائی دیتی ہوئی۔ روزانہ دروازے کھول دیئے جاتے ہیں تاکہ وہاں سے ہوا گزرے اور

لکڑی کو سکھائے اور رات کو آوارہ کتوں اور پہاڑی سمگلروں کے لئے بند۔

تو یوں وہ رے آم کی کنٹین نہیں تھی، میں آپ کو بتاتی چلوں، جیسے کہ میں نے پہلے لکھا تھا، جہاں کالی لیموزین والے امیر آدمی سے میری ملاقات ہوئی تھی، یہ زمین کو چھوڑ دینے کے بعد، دو یا تین سال بعد، کشتی پر، جس دن کی میں بات کررہی ہوں، اس دھندلی روشنی اور گرمی والے دن۔

میری اس ملاقات کے ڈیڑھ سال کے بعد ماں ہمارے ساتھ واپس فرانس جاتی ہے۔ وہ اپنا تمام فرنیچر بیچے گی۔ اور پھر وہ ایک آخری مرتبہ بیراج پر جائے گی۔ وہ ڈوبتے ہوئے سورج میں ورانڈے میں بیٹھے گی، ایک دفعہ پھر سیام کی پہاڑیوں کی طرف دیکھے گی، ایک آخری مرتبہ، پھر کبھی نہیں، اس وقت بھی نہیں جب وہ فرانس کو ایک مرتبہ پھر چھوڑے گی، جب وہ پھر اپنا ارادہ بدلے گی، اور وہ دوبارہ ہندو چین میں اپنی ریٹائر شدہ زندگی سائیگون میں گذارنے کے لئے آئے گی، وہ پھر کبھی اس پہاڑ کے سامنے نہیں جائے گی، جنگل کے اوپر اس زرد اور ہرے آسمان کو دیکھنے کے لئے۔

ہاں، میں بتاتی چلوں، اپنی زندگی کے اواخر میں اس نے دوبارہ آغاز کیا۔ اس نے فرانسیسی زبان پڑھانے کا ایک سکول شروع کیا، نوویل ایکول

فرانسیز، جس سے وہ اس قابل ہوجائے گی کہ میری پڑھائی کے خرچے کا ایک حصہ برداشت کرے اور اپنی زندگی کے اختتام تک اپنے بڑے بیٹے کو روزی فراہم کرسکے۔

چھوٹا بھائی تین دن کے اندر اندر شعبی نمونیا سے فوت ہوگیا، اس کا دل ساتھ نہ دے سکا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب میں نے اپنی ماں کو چھوڑ دیا۔ یہ جاپانی قبضہ کے زمانے میں ہوا۔ اس دن کے بعد سب کچھ ختم ہوگیا۔ اس کے بعد میں نے کبھی بھی اس سے اپنے بچپن کے بارے میں، اس کے بارے میں، کبھی کوئی سوال نہیں کیا۔ میرے لئے وہ میرے چھوٹے بھائی کی موت کے ساتھ ہی مرگئی۔ جیسے میرا بڑا بھائی بھی۔ میں اس دہشت پر کبھی غالب نہیں آ سکی جسے انہوں نے یکدم میرے اندر پیدا کردیا تھا۔ میرے لئے اب ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس دن کے بعد سے مجھے ان کی کوئی خبر نہیں ہے۔ میں اب تک سمجھ نہیں سکی کہ وہ چٹی سود خوروں کے قرضے اتارنے میں کیسے کامیاب ہوئی۔ ایک دن وہ آنا بند ہوگئے۔ مجھے وہ اب بھی دکھائی دیتے ہیں۔ وہ سادیک والے گھر کی چھوٹی بیٹھک میں بیٹھے ہیں، انہوں نے سفید سادیک لہنگے پہنے ہوئے ہیں، وہ خاموشی سے وہاں بیٹھے رہتے ہیں، مہینوں، سالہا سال۔ میری ماں کی آواز سنائی دیتی ہے جو رو رہی ہے اور انہیں گالیاں دے رہی ہے، وہ اپنے کمرے میں ہے، وہ وہاں سے نکلنا نہیں چاہتی، وہ چیخ

رہی ہے کہ وہ اس کا پیچھا چھوڑ دیں، وہ بہرے ہیں، خاموش ہیں، مسکرا رہے ہیں اور وہاں سے ہلتے نہیں۔ اور پھر ایک دن انہوں نے آنا بند کردیا۔ وہ اب فوت ہوچکے ہیں، ماں اور دونوں بھائی۔ یادوں کیلئے بھی اب بہت دیر ہوچکی ہے۔ اب مجھے ان سے کوئی محبت نہیں رہی۔ اب مجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ مجھے ان سے کبھی محبت تھی۔ میں نے ان کو چھوڑ دیا۔ میرے دماغ میں نہ تو اس کے جسم کی خوشبو ہے اور نہ ہی میری آنکھوں میں اس کی آنکھوں کا رنگ۔ مجھے تو اب اس کی آواز بھی یاد نہیں، سوائے شام کی تھکاوٹ کی وجہ سے اس کی نرم اور میٹھی آواز کے۔ ہنسی تو اب مجھے سنائی نہیں دیتی، نہ ہنسی اور نہ ہی چیخیں۔ اب سب کچھ ختم ہوگیا ہے، اب مجھے کچھ یاد نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب میں اس کے بارے میں اتنی آسانی سے لکھ سکتی ہوں، اتنا زیادہ، اتنے کلی طور پر، اب وہ رواں خط کی طرح ہوگئی ہے۔

وہ سائیگون میں 1932 سے 1949 تک رہی، وہ عورت۔ دسمبر 1942 میں میرا چھوٹا بھائی فوت ہوا۔ اب وہ کہیں نہیں جاسکتی تھی۔ وہ وہیں رہتی ہے، قبر کے نزدیک، وہ کہتی ہے۔ اور پھر آخرکار وہ فرانس واپس پلٹ جاتی ہے۔ میرے بیٹے کی عمر دو سال تھی جب ہم ایک دوسرے سے دوبارہ ملے۔ اکٹھے ہونے کے لئے اب بہت دیر ہوچکی تھی۔ پہلی ہی نگاہ میں ہم سمجھ گئے۔ اب ہمارے اکٹھے ہونے کے لئے کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ اُس کے لئے بڑے

بیٹے کے علاوہ باقی تمام لوگ اب ختم ہو چکے تھے۔ وہ رہنے اور مرنے کے لئے لوآر اور شیر کے ایک نقلی قلعہ نما محل، جو لوئی چہاردہم کے قلعہ کی طرز کا تھا، میں چلی گئی۔ وہ دوؔ کے ساتھ رہتی تھی۔ اُسے ابھی بھی رات سے خوف آتا تھا۔ اس نے ایک بندوق خرید لی تھی۔ دوؔ قلعہ کی آخری منزل کے بالا خانوں میں بیٹھ کر رکھوالی کرتی تھی۔ اُس نے اپنے بڑے بیٹے کو آمبوآز کے نزدیک کچھ جائداد خرید کر دی تھی۔ وہاں چھوٹے جنگلات تھے۔ بیٹے نے انہیں مکمل طور پر کٹوادیا۔ وہ اس رقم سے پیرس کے ایک بیکراٹ کلب میں جوا کھیلنے چلا گیا۔ جنگلات ایک ہی رات میں ہارے گئے۔ جہاں میری یادیں یکدم نرم پڑجاتی ہیں، اور جہاں بھائی کے لئے میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں، وہ جنگلات کے ان پیسوں کے ہارنے کے بعد کا منظر ہے۔ جو کچھ مجھے یاد ہے وہ یہ کہ اُسے اپنی کار میں، موں پارناس کے علاقہ میں، لاکوپول کے سامنے، لیٹا ہوا پایا گیا، اور یہ کہ وہ مر جانا چاہتا ہے۔ اس کے بعد، مجھے کچھ علم نہیں۔ اس نے، اُس عورت نے، جو کچھ اپنے قلعہ کے ساتھ کیا، اس کا تصور کرنا بھی بہت مشکل ہے۔ اور اس نے یہ سب کچھ اپنے بڑے بیٹے کے لئے کیا، جو کہ ابھی تک، پچاس سال کا بچہ، کمائی کے قابل نہیں ہے۔ وہ بجلی کے انکیوبیٹر خریدتی ہے، اور انہیں گھر کے پچھلے حصہ کے بڑے تقریبی کمرے میں نصب کرواتی ہے۔ اور یکدم اس کے پاس چھ سو چوزے پیدا ہوجاتے ہیں، 40 مربع میٹر کی جگہ چوزوں سے بھر جاتی ہے۔ اس سے انکیوبیٹر کی زیریں سرخ

شعاعوں کے استعمال میں کچھ غلطی ہوجاتی ہے، نتیجتاً کوئی بھی چوزہ خوراک کھانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ چھ سو چوزوں کی چونچ کا ایک حصہ دوسرے پر ٹھیک نہیں بیٹھتا، چونچ بند نہیں ہوتی، اور یوں وہ بھوک و پیاس سے مرجاتے ہیں، وہ دوبارہ پھر کبھی چوزے نہیں پالتی۔ میں انڈوں سے چوزوں کے نکلنے کے دنوں میں قلعہ میں آئی تھی، یہاں جشن کا سماں تھا۔ اُس کے بعد مردہ چوزوں اور ان کی خوراک کی بدبو اتنی شدید ہوگئی تھی کہ ماں کے اس قلعہ نما محل میں کھانا کھاتے ہی مجھے الٹی آجاتی تھی۔

وہ دوؔ اور ابنِ شخص کے درمیان فوت ہوئی جسے وہ اپنا بچہ کہتی تھی، پہلی منزل کے بڑے کمرہ میں، وہی کمرہ جس میں وہ اپنی بھیڑوں کو سلاتی، آخری سالوں کے سردیوں کے موسم میں، کہر پڑنے والے موسم میں، چار سے لیکر چھ بھیڑیں اس کے بستر کے اردگرد ہوتیں۔

یہیں، اپنے آخری گھر میں، لوآر والا، وہ اپنے مسلسل آنے جانے کو ختم کرتی ہے، اس خاندان کے اختتام پر، یہیں میں پاگل پنے کو پہلی دفعہ صاف طور پر دیکھتی ہوں۔ میں دیکھتی ہوں کہ میری ماں واقعی پاگل ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ دوؔ اور میرے بھائی کو ہمیشہ سے اس پاگل پنے کا علم تھا۔ کہ مجھے، نہیں، میں نے ابھی تک یہ نہیں دیکھا تھا۔ کہ میں نے اپنی ماں کو کبھی بھی پاگل پنے کی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ لیکن وہ تھی۔ پیدائش سے ہی۔ خون

میں۔ وہ اپنے پاگل پن کی وجہ سے بیمار نہیں تھی، وہ اسے تندرستی کی طرح گذار رہی تھی۔ دو اور بڑے بیٹے کے درمیان۔ ان کے علاوہ کسی دوسرے کو اس کا علم نہیں تھا۔ ماں کے ہمیشہ سے ہی بہت دوست رہے تھے، وہ سالوں سال انہیں دوستوں سے دوستی رکھتی اور وہ ہمیشہ نئے دوست بھی بناتی، اکثر بہت جوان، دور دراز کے علاقوں کے افسران، یا بعد میں تورین میں بہت سے دوست جن میں سے بعض فرانسیسی نوآبادیوں سے واپس آئے تھے۔ اس کے اردگرد ہمیشہ کئی لوگ ہوتے، خواہ وہ کسی بھی عمر کے ہوں، اپنی ذہانت کی وجہ سے، ان لوگوں کا کہنا تھا، کہ وہ اتنی زندہ دل تھی، اتنی بشاش، اس کی بے مثل طبیعت، جس سے بندہ کبھی تھکتا نہیں تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ یہ یاسیت بھری تصویر کس نے کھینچی ہے۔ ہنوئی والے گھر کے صحن میں کھینچی جانے والی تصویر۔ شاید یہ آخری تصویر تھی جو میرے باپ نے لی تھی۔ اس کے چند ماہ بعد، اس کی خراب صحت کی وجہ سے اسے فرانس واپس بھیج دیا گیا تھا۔ اس سے پہلے، اس کی ایک نئی جگہ پر تبدیلی ہوگئی تھی، پنوم پین میں۔ وہ وہاں چند ہفتے ہی رہتا ہے۔ سال کے اندر اندر وہ فوت ہوجاتا ہے۔ میری ماں نے اس کے ساتھ واپس فرانس جانے سے انکار کردیا تھا، وہ وہیں رہی جہاں وہ تھی، وہیں اٹکی ہوئی۔ پنوم پین میں۔ اس شاندار گھر میں جو دریائے مکونگ کے سامنے ہے، کمبوڈیا کے بادشاہ کا پرانا محل، ایکڑوں پر پھیلے ہوئے اس دہشت کن رقبۂ زمین کے وسط میں، جس سے

ماں کو ڈر لگتا ہے۔ رات کو وہ ہمیں بھی ڈرا دیتی ہے۔ ہم چاروں ایک ہی بستر میں سوتے ہیں۔ وہ کہتی ہے کہ اسے رات سے خوف آتا ہے۔ میرے باپ کی موت کی خبر بھی اُسے اسی گھر میں ملے گی۔ اسے یہ خبر تار ملنے سے پہلے ہی ملے گی، اس کی موت سے ایک رات پہلے، ایک شگون کے ذریعہ جسے صرف وہ اکیلی ہی دیکھ اور سمجھ سکتی تھی، ایک پرندہ کے ذریعہ جس نے عین آدھی رات کو آواز نکالی تھی، پرندہ جو ڈر کر، اور بھٹک کر محل کے شمالی حصہ میں واقع دفتر میں آیا تھا، میرے باپ کا دفتر۔ نیز یہی وہ کمرہ تھا، جہاں اپنے خاوند کی موت کے کچھ دن بعد، وہ بھی عین رات، میرں ماں کا اپنے باپ کے عکس سے سامنا ہوا تھا، وہ روشنی جلاتی ہے۔ وہ وہاں کھڑا ہے۔ وہ میز کے کنارے کے ساتھ ہے، کھڑا ہے، محل کے بڑے ہشت پہلو کمرہ میں۔ وہ اس کی طرف دیکھتا ہے۔ مجھے ایک چیخ یاد ہے، ایک پکار۔ ماں نے ہمیں جگایا، اُس نے ہمیں پوری کہانی سنائی، کہ اس نے کون سے کپڑے پہنے ہوئے تھے، اتوار والا سوٹ، خاکی، کہ وہ کیسے کھڑا تھا، اور اس کی نظریں، سیدھی اسی کی طرف۔ وہ کہتی ہے: میں نے اُسے اُسی طرح پکارا جیسے میں بچپن میں اُسے پکارتی تھی۔ وہ کہتی ہے: مجھے ڈر بالکل نہیں لگا۔ وہ غائب ہونے والے عکس کی طرف دوڑی۔ وہ دونوں، پرندوں اور عکسوں والی تاریخ اور وقت پر فوت ہوئے۔ بلاشبہ اس سے ہماری نظروں میں اپنی ماں کی اس کے علم کی وجہ سے وقعت اور بڑھ گئی، ہر معاملہ میں، حتیٰ کہ موت کے متعلق بھی۔

خوش وضع آدمی لیموزین سے نیچے اتر آیا ہے، وہ ایک برطانوی سگریٹ پی رہا ہے۔ وہ نمدے کا مردانہ ہیٹ اور طلّے والے جوتے پہنے ہوئی لڑکی کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ کچھ گھبرایا گھبرایا سا ہے۔ شروع میں وہ مسکراتا نہیں۔ پہلے وہ لڑکی کو سگریٹ پیش کرتا ہے۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ آخر نسل بھی تو مختلف ہے، وہ سفید فام نہیں ہے، اسے اس فرق پر غالب ہونا پڑے گا اور اسی وجہ سے وہ کانپ رہا ہے۔ وہ اسے کہتی ہے کہ وہ سگریٹ نہیں پیتی، نہیں شکریہ۔ وہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہتی، وہ یہ نہیں کہتی کہ آپ مجھے تنگ نہ کریں۔ اس لئے اس شخص کو اتنا ڈر نہیں۔ پھر وہ کہتا ہے کہ اِسے دیکھ کر اُسے یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ کچھ جواب نہیں دیتی۔ کوئی جواب دینے کی ضرورت بھی نہیں، وہ جواب دے بھی کیا سکتی ہے؟ وہ انتظار کرتی ہے۔ پھر وہ اس سے پوچھتا ہے: کہاں سے ہیں آپ؟ وہ کہتی ہے کہ وہ سادیک کے لڑکیوں کے سکول کی استانی کی بیٹی ہے۔ وہ کچھ دیر سوچتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ اُس نے اِس خاتون کے بارے میں، اس کی ماں کے بارے میں، سنا ہے، اس کی کمبوڈیا میں خریدی ہوئی زمین کی بدقسمتی کے بارے میں بھی آگاہ ہے۔ ٹھیک ہے نا؟ ہاں ٹھیک ہے۔

پھر وہ کہتا ہے کہ وہ اُسے اِس کشتی پر دیکھ کر بہت حیران ہوا ہے، اتنی صبح صبح، اُس جیسی اتنی خوبصورت لڑکی، آپ نہیں سمجھ سکتیں، یہ بات بہت حیران

کن ہے، ایک نوجوان گوری لڑکی دیسیوں کی بس میں۔

وہ اُسے کہتا ہے کہ ہیٹ اُسے سجتا ہے، بلکہ بہت سجتا ہے، کہ یہ بالکل نرالا انداز ہے۔ ایک مردانہ ہیٹ، لیکن کیوں نہیں؟ وہ اتنی خوبصورت ہے کہ وہ جو چاہے کرسکتی ہے۔

وہ اس کی طرف دیکھتی ہے۔ پوچھتی ہے کہ وہ کون ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ پیرس سے آیا ہے، جہاں وہ پڑھائی کررہا تھا، وہ بھی سادیک میں رہتا ہے، بلکہ دریا کے کنارے پر، اس بڑے مکان میں جس کے بڑے بڑے چبوترے ہیں اور جن پر نیلی اینٹوں کے کنگرے بنے ہوئے ہیں۔ وہ اس سے پوچھتی ہے کہ وہ کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ وہ چینی ہے، اس کا خاندان شمالی چین سے ہے، فوچوئین کے علاقہ سے۔ اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں آپ کو سائیگون میں آپ کے گھر چھوڑ آؤں؟ وہ کہتی ہے ٹھیک ہے۔ وہ شوفر سے کہتا ہے کہ وہ بس سے لڑکی کا سامان اٹھائے اور کالی کار میں رکھ دے۔

چینی۔ تو وہ چین سے آئے ہوئے لوگوں کی اس سرمایہ کار اقلیت سے ہے جو کالونی میں مزدوروں اور عام لوگوں کے رہائشی مکانوں کے مالک ہیں۔ یہ وہی ہے جو اس دن دریائے میکونگ پار کرتے ہوئے سائیگون جارہا تھا۔

وہ کالی کار میں بیٹھ جاتی ہے۔ دروازہ بند ہوجاتا ہے۔ لڑکی پر یکدم ایک ہلکی سی تکلیف طاری ہوجاتی ہے، ایک تھکان سی، دریا پر پڑتی ہوئی روشنی مدھم

ہو رہی ہے، لیکن معمولی، اور کچھ کچھ بہرا پن بھی، ہر طرف دھند ہی دھند۔

اب میں کبھی بھی مقامی لوگوں کی بس میں سفر نہیں کروں گی۔ آج کے بعد، میرے پاس ایک لیموزین ہوگی جو مجھے لیسے لے کر جایا کرے گی اور واپس بورڈنگ سکول چھوڑ کر بھی۔ میں شہر کے بہترین ریستورانوں میں کھانا کھایا کروں گی۔ اور پھر میں اپنے آپ پر ہمیشہ نادم رہوں گی، اُس پر جو کہ میں کر رہی ہوں، اور جو کچھ میں چھوڑ رہی ہوں، اور جو کچھ میں حاصل کر رہی ہوں، اچھے کے ساتھ بُرا، وہ بس، اُس بس کا وہ ڈرائیور جس کے ساتھ میں باتیں کر کے ہنستی تھی، وہ بوڑھی عورتیں جو بس کی پچھلی سیٹوں پر بیٹھی مسلسل پان کھاتی رہتی تھیں، وہ بچے جو سامان رکھنے والے جنگلوں پر بیٹھے ہوتے تھے، سادیک کا خاندان، سادیک کے خاندان کی دہشت، اور سادیک کے خاندان کی یہ زبردست خاموشی۔

آدمی بول رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اسے پیرس بہت یاد آ رہا ہے، پیرس کی انتہائی دلکش عورتیں، وہاں کی عیاشی، وہاں کے شغل مے نوشی، او لالا، وہ کوپول، وہ روتوند، مجھے تو روتوند زیادہ پسند ہے، وہاں کے نائٹ کلب، وہاں کی ''زبردست'' زندگی جس میں اس نے دو سال گزارے تھے۔ لڑکی اس کی باتیں سن رہی تھی، اور خاص طور پر ان تفصیلات پر دھیان دے رہی تھی جو کہ

اس کی دولت کے بارے میں تھیں، جو اس کے پاس موجود لاکھوں کی رقم کے متعلق کچھ اشارہ کرسکتی تھیں۔ وہ مسلسل بولتا رہا۔ اُس کی ماں فوت ہوچکی تھی، وہ اکلوتا بیٹا تھا۔ اب صرف اس کا باپ ہے جس کے پاس ساری دولت ہے۔ لیکن آپ تو جانتی ہیں نا کہ کیا ہوتا ہے، وہ پچھلے دس سال سے دریا کے سامنے بیٹھا ہے، افیم کے پائپ سے چمٹا ہوا، وہ اپنی دولت کو ایک لوہے کی چارپائی پر بیٹھا کنٹرول کررہا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ وہ سمجھتی ہے۔

باپ اپنے بیٹے کو سادیک میں رہنے والی ایک چھوٹی گوری طوائف سے کبھی بھی شادی کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔

تصویر اس وقت سے بہت پہلے شروع ہوتی ہے جب وہ آدمی جنگلے سے ٹیک لگائے، اِس سفید فام لڑکی کے نزدیک آیا، اُس لمحہ جب وہ کالی لیموزین سے نیچے اترا، جب اُس نے اس کی طرف بڑھنا شروع کیا، اور لڑکی، لڑکی کو پتہ چل گیا، پتہ چل گیا کہ وہ ڈر رہا تھا۔

لڑکی کو پہلے لمحہ میں ہی تھوڑا بہت پتہ چل گیا، پتہ چل گیا کہ وہ اس کے رحم و کرم پر ہے۔ اور اس کا مطلب یہ کہ اُس کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اس کے رحم و کرم پر ہوسکتے ہیں اگر کبھی اس قسم کا موقع پیش آیا۔ وہ کچھ اور بھی جانتی ہے، کہ اب یقیناً وہ وقت آ گیا ہے جب وہ چند اُن ذمہ داریوں سے، جو اس کی اپنی ذات سے متعلق ہیں، نہیں بچ سکتی۔ نیز یہ کہ ان چیزوں کے

بارے میں ماں کو بالکل پتہ نہیں لگنا چاہیئے، اور نہ ہی بھائیوں کو، اس چیز کا بھی اسے اسی دن پتہ چل گیا۔ اسی لمحہ سے جب وہ کالی لیموزین کے اندر بیٹھی، اُسے اس چیز کا احساس ہوگیا، کہ اب پہلی دفعہ اور ہمیشہ کے لئے وہ اپنے خاندان سے علیحدہ ہے۔ آج کے بعد انہیں کچھ پتہ نہیں لگنا چاہیئے کہ اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ اگر کوئی اُسے اُن سے چھین لیتا ہے، اگر کوئی اسکو اٹھا کر لے جاتا ہے، اسے زخمی کردیتا ہے، اسے ضائع کردیتا ہے، اُنہیں اِس کا پتہ نہیں لگنا چاہیئے۔ نہ ماں کو، نہ ہی بھائیوں کو۔ آج کے بعد یہی ان کی قسمت ہوگی۔کالی لیموزین میں ابھی سے رونے کا سامان ہے۔

اب لڑکی کو اس آدمی کے ساتھ نبٹنا ہوگا، پہلا آدمی، جس نے کشتی پر اپنا تعارف کرایا تھا۔

اس دن، جمعرات کے دن، یہ سب کچھ بہت تیزی سے ہوا۔ وہ ہر روز اسے لیسے سے لینے اور بورڈنگ سکول چھوڑنے کے لئے آتا۔ اور پھر ایک دفعہ وہ جمعرات کی دوپہر کو بورڈنگ سکول میں آیا۔ اُسے کالی کار میں بٹھا کر لے گیا۔

یہ چولون ہے۔ شاہراہوں کی دوسری طرف، علاقہ جو اس چینی شہر کو سائیگون کے مرکز سے جوڑتا ہے، یہ امریکن طرز کی بڑی بڑی سڑکیں جن پر ٹرامیں، رکشے اور بسیں چلتی ہیں۔ دوپہر کا ابتدائی وقت ہے۔ لڑکی نے

بورڈنگ سکول کی بچیوں کی لازمی چہل قدمی سے اپنا پیچھا چھڑا لیا تھا۔

یہ شہر کے جنوب میں واقع ایک رہائشی علاقہ میں کمرہ ہے۔ یہ جگہ جدید ہے اور یوں لگتا ہے کہ اس کو جلدی میں تیار کیا گیا ہے اور فرنیچر بھی نہایت جدید انداز کا ہے۔ وہ کہتا ہے: فرنیچر کا انتخاب میرا نہیں ہے۔ کمرہ میں اندھیرا ہے، وہ اسے شٹر کھولنے کو نہیں کہتی۔ وہ کسی بھی خاص احساس سے عاری ہے، نہ نفرت، نہ گھن۔تو کیا یہ بلاشبہ خواہش ہی ہے۔ لیکن وہ نہیں جانتی۔کل شام کو جب اس آدمی نے اسے یہاں آنے کی دعوت دی تھی تو وہ فورا راضی ہوگئی تھی۔ وہ اب وہاں ہی ہے جہاں اسے ہونا چاہیئے تھا، اسی جگہ پر۔اُسے تھوڑا تھوڑا ڈر بھی لگ رہا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جو کچھ ہورہا ہے وہ نہ صرف وہی ہے جس کی اسے توقع تھی، بلکہ ہوبہو وہی جوکہ اس کے ساتھ ہونا چاہیئے تھا۔ وہ بند دروازے سے باہر پیش آنے والی چیزوں پر بہت دھیان دے رہی ہے، روشنی پر، شہر کے شور وغل پر جس سے کمرہ بھرا ہوا ہے۔ آدمی، وہ کانپ رہا ہے۔ پہلے تو وہ اِس کی طرف ایسے دیکھتا ہے کہ جیسے وہ انتظار میں ہو کہ لڑکی کچھ کہے، لیکن وہ کچھ نہیں کہتی۔اِس لئے وہ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلتا، وہ اُس کے کپڑے نہیں اتارتا، وہ کہتا ہے کہ وہ اِس سے والہانہ محبت کرتا ہے، وہ یہ بہت دھیمے سے کہتا ہے۔ اور پھر وہ خاموش ہوجاتا ہے۔ وہ اسے کچھ جواب نہیں دیتی۔ وہ یہ جواب دے سکتی تھی کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتی۔ وہ کچھ نہیں کہتی۔ اچانک، اسی لمحہ اسے پتہ چل جاتا

ہے، وہیں، ابھی ابھی، اسے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ اُسے نہیں سمجھتا، وہ اسے کبھی بھی نہیں سمجھ سکے گا، کہ اُس میں اتنی گمراہی سمجھنے کے لئے قابلیت نہیں ہے۔ نیز اسے پکڑنے کے لئے اتنے پُر پیچ راستوں سے گزرنا، وہ کبھی بھی یہ نہیں کر سکے گا۔ یہ سب کچھ جاننا اُس کا کام ہے۔ اور وہ جانتی ہے۔ اُس آدمی کی لاعلمی کی وجہ سے اسے یکدم اس کا احساس ہوگیا ہے: وہ آدمی اسے کشتی پر ہی پسند آ گیا تھا۔ وہ اسے پسند ہے، اور یہ سب کچھ صرف اسی پر منحصر تھا۔

وہ اسے کہتی ہے: میں یہ چاہوں گی کہ آپ مجھ سے محبت نہ کریں۔ اگر آپ کو مجھ سے محبت ہے بھی تو میری یہ خواہش ہے کہ آپ وہی کریں جو آپ دوسری عورتوں کے ساتھ عموماً کرتے ہیں۔ وہ اسے کچھ خوفزدہ سا ہوکر دیکھتا ہے اور پوچھتا ہے: تو کیا آپ یہی چاہتی ہیں؟ وہ کہتی ہے ہاں۔ اس لمحہ سے اُسے دکھ لگ جاتا ہے، اس کمرہ میں، پہلی دفعہ، وہ اس بات کو بالکل نہیں جھٹلاتا۔ وہ اِسے کہتا ہے کہ اُسے پہلے ہی سے یہ علم ہے کہ وہ اس سے کبھی محبت نہیں کرے گی۔ لڑکی اسے ٹوکتی نہیں۔ پہلے وہ کہتی ہے کہ اُسے پتہ نہیں۔ پھر وہ اسے یہ کہنے دیتی ہے۔

وہ کہتا ہے کہ وہ اکیلا ہے، سنگدلانہ طریقہ سے اکیلا، وہ اسے اپنی تنہائی کے متعلق بتاتا ہے، اس شدید محبت میں جو اُسے اِس کے ساتھ ہے۔ وہ اُسے

کہتی ہے کہ وہ خود بھی تنہا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں بتاتی کہ کیوں۔ وہ کہتا ہے: آپ میرے ساتھ یہاں یوں چل کر آئی ہیں جیسے آپ کسی بھی دوسرے کے ساتھ یونہی جاسکتی تھیں۔ وہ جواب دیتی ہے کہ وہ یہ جان نہیں سکتی کیونکہ وہ اب تک کسی دوسرے آدمی کے ساتھ اس کے کمرے میں نہیں گئی۔ وہ اُسے کہتی ہے کہ وہ نہیں چاہتی کہ وہ اس سے باتیں کرے، کہ جو وہ چاہتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ وہی کرے جو وہ عموماً اُن عورتوں کے ساتھ کرتا ہے جنہیں وہ یہاں، اپنے فلیٹ میں لے کر آتا ہے۔ وہ اس کی منت کرتی ہے کہ وہ اُسی طریقہ سے کرے۔

وہ اس کا فراک زور سے کھینچ کر اُتارتا ہے، اور اُسے زمین پر پھینک دیتا ہے، وہ اس کے سفید سوتی جانگیہ کو زور سے اتارتا ہے اور یوں اسے برہنہ بستر تک لے جاتا ہے۔ اور پھر وہ بستر کے دوسری طرف رخ موڑ لیتا ہے اور رونا شروع کردیتا ہے۔ اور لڑکی، آہستہ آہستہ، صبر کے ساتھ، اُسے اپنی طرف کھینچتی ہے اور اس کے کپڑے اتارنا شروع کردیتی ہے۔ آنکھیں بند کئے ہوئے، وہ یہ کرتی ہے۔ آہستہ آہستہ۔ وہ اس کی مدد کرنے کے لئے اپنے ہاتھ ہلانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اس سے کہتی ہے، ہلو نہیں۔ مجھے کرنے دو۔ وہ کہتی ہے کہ وہ یہ خود ہی کرنا چاہتی ہے۔ اور وہ کرتی ہے۔ وہ اس کے کپڑے اتارتی ہے۔ جب وہ اس سے کہتی ہے تو وہ اپنے جسم کو بستر میں ہلاتا

ہے، لیکن بس تھوڑا سا، ہلکا سا، جیسا کہ وہ اسے، لڑکی کو جگانا نہیں چاہتا۔

اس کی جلد حیرت انگیز طریقہ سے نرم ہے۔ اور جسم۔ جسم پتلا ہے، بے قوت، پٹھوں کے بغیر، ہوسکتا ہے کہ وہ پہلے بیمار رہا ہو، بیماری کے بعد تندرست ہورہا ہو، اس کے بال نہیں ہیں، مردانگی والی کوئی علامت نہیں ماسوا اس کے عضو تناسل کے، وہ بہت کمزور ہے، وہ کسی توہین کا شکار، تکلیف میں۔ وہ اس کے چہرے کی طرف نہیں دیکھتی۔ وہ اس کی طرف نہیں دیکھتی۔ وہ اسے چھوتی ہے۔ وہ اس کے عضو تناسل کی نرمی کو چھوتی ہے، اس کی جلد کو، وہ سنہری رنگ کو چمکارتی ہے، جس میں اس کے لئے انجانا نیا پن ہے۔ وہ کراہتا ہے، وہ روتا ہے۔ وہ ایک بھیانک محبت میں پھنس گیا ہے۔ اور روتے روتے وہ پیار کرتا ہے۔ پہلے پہلے تو درد۔ اور پھر یہ درد قابو میں لئے جاتا ہے، تبدیل ہوجاتا ہے، آہستہ آہستہ ختم ہونا شروع ہوجاتا ہے، لذت کی طرف پہنچتا ہے، اس سے ہم آغوش۔

سمندر، بے شکل، مکمل طور پر بے مثال۔

کشتی پر ہی، اپنے وقت سے پہلے، تصویر اس لمحے میں شامل ہوچکی تھی۔

رفو کی ہوئی جرابوں والی عورت کی تصویر کمرے میں سے گزرتی ہے۔ بالآخر وہ اس میں ایک بچی کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ بیٹے پہلے ہی سے

جانتے تھے۔ لڑکی، ابھی تک نہیں۔ وہ اکٹھے کبھی ماں کے بارے میں بات نہیں کرتے، ان معلومات کے متعلق جن کا انہیں علم ہے، اور جو انہیں لڑکی سے جدا کرتا ہے، اس فیصلہ کن اور حتمی علم کا، ماں کے بچپن کے بارے میں۔

ماں لذت سے ناآشنا ہے۔

میں نہیں جانتا تھا کہ خون بھی بہتا ہے۔ وہ مجھ سے پوچھتا ہے کہ درد تو نہیں ہوا، میں کہتی ہوں نہیں۔ وہ کہتا ہے اسے یہ سن کر خوشی ہوئی۔

وہ خون کو پونچھتا ہے، وہ مجھے دھوتا ہے۔ میں اُسے یہ کرتے دیکھتی ہوں۔ آہستہ آہستہ وہ واپس آتا ہے، وہ دوبارہ دل پسند ہوجاتا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ مجھ میں، اپنی ماں کی نافذ کی ہوئی ممانعت کے خلاف کام کرنے کی طاقت کہاں سے آئی، اتنے اطمینان کے ساتھ، اتنے عزم کے ساتھ۔ کیسے میں ''خیال سے عمل کی انتہا تک'' پہنچی، میں نہیں جانتی۔

ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔وہ میرے جسم کو اپنی بانہوں میں لے لیتا ہے۔

وہ مجھ سے پوچھتا ہے کہ میں کیوں اس کے ساتھ یہاں آئی۔ میں کہتی ہوں کہ مجھے یہ کرنا تھا، کہ یہ ایک قسم کا فرض تھا۔ یہ پہلی دفعہ تھا کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کررہے تھے۔ میں اسے اپنے دونوں بھائیوں کے بارے میں بتاتی ہوں۔ میں کہتی ہوں کہ ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ کچھ

نہیں بچا۔ وہ بڑے بھائی کو جانتا ہے، اُس کی اس سے علاقے کے مختلف افیم خانوں میں ملاقات ہوچکی ہے۔ میں بتاتی ہوں کہ یہ بھائی میری ماں کے پیسے چراتا ہے تاکہ افیم پی سکے، کہ وہ نوکروں کی جمع پونجی چراتا ہے، اور کبھی کبھی افیم خانوں کے مالک میری ماں سے پیسے مانگنے آتے ہیں۔ میں اسے بیراجوں کے بارے میں بتاتی ہوں۔ میں کہتی ہوں کہ میری ماں مرجائے گی، ایسے حالات اب زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتے۔ کہ میری ماں کی جلد آنے والی موت کا بھی یقیناً اس امر کے ساتھ تعلق ہوگا جو میرے ساتھ آج پیش آیا ہے۔

میں محسوس کرتی ہوں کہ مجھے اُس کی خواہش ہے۔

اس کو مجھ پر ترس آتا ہے، میں اسے کہتی ہوں کہ نہیں، مجھ پر ترس کھانے کی ضرورت نہیں، کسی پر ترس کھانے کی ضرورت نہیں، ماسوا میری ماں کے۔ وہ مجھے کہتا ہے: تم میرے پاس آئی ہو کیونکہ میرے پاس دولت ہے۔ میں کہتی ہوں کہ مجھے اُس کی اس کی دولت سمیت خواہش ہے، کہ جب میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو وہ اپنی کار میں تھا، دولت کے ساتھ، اس لئے مجھے اس کا قطعاً کوئی اندازہ نہیں کہ اگر یہ سب کچھ ایسے نہ ہوتا تو میں کیا کرتی۔وہ کہتا ہے: میں چاہتا ہوں کہ میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں، تمہارے ساتھ چلا جاؤں۔ میں کہتی ہوں کہ میں ابھی اپنی ماں کو نہیں چھوڑ سکتی، کیونکہ میں دکھ سے مرجاؤں گی۔ وہ کہتا ہے حقیقت یہ ہے کہ میرے

ساتھ وہ خوش قسمت نہیں ہے، لیکن پھر بھی وہ مجھے پیسے دے گا، فکر نہ کرو۔ وہ دوبارہ بستر پر لیٹ گیا ہے۔ ایک بار پھر ہم خاموش ہوجاتے ہیں۔

شہر سے آنے والا شور بہت زیادہ ہے، میری یادوں میں وہ ایک فلم کی آواز کی طرح ہے لیکن بہت اونچی، بہرا کردینے والی آواز۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے، کمرہ اندھیرا ہے، ہم خاموش ہیں، کمرہ میں ہر طرف شہر سے مسلسل آنے والا شور ہی شور ہے، شور جو شہر میں پھیلا ہوا ہے، جو شہر کی روز مرہ زندگی کا حصہ ہے۔ کھڑکیوں میں شیشے نہیں ہیں، صرف شٹر اور روشنی بند لگے ہوئے ہیں۔ شٹروں پر فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے لوگوں کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ لوگوں کے یہ جمگھٹے ہمیشہ بہت بڑے ہوتے ہیں۔ پرچھائیاں روشنی بندوں کی پٹیوں میں تقسیم ہوتی رہتی ہیں۔ لکڑی کی کھڑاووں سے ہونے والی ٹک ٹک کی آواز دماغ میں باقاعدگی کے ساتھ گھستی چلی جاتی ہے، آوازیں کان پھاڑ ہیں، چینی ایسی زبان ہے جسے چیخ کر بولا جاتا ہے، جیسا کہ میرا خیال ہے کہ تمام صحرائی زبانوں کے ساتھ ہوتا ہے، یہ زبان حیرت انگیز طور پر عجیب وغریب ہے۔

باہر دن ڈھل رہا ہے، اس کا آوازوں کے شور سے پتہ چلتا ہے، زیادہ سے زیادہ گزرتے ہوئے راہ گیروں کا شور، بے شمار مختلف آوازوں کا شور۔ یہ خوشیوں کا شہر ہے جو رات کو اپنے عروج کو پہنچتا ہے۔ اور اب ڈوبتے سورج کے ساتھ رات کا آغاز ہی ہے۔

بستر کو شہر سے الگ کرنے والی صرف یہ جھلملیاں اور سوتی پردے ہی ہیں۔ یہاں کوئی ایسی ٹھوس آڑ نہیں ہے جو ہمارے اور لوگوں کے درمیان حائل ہو۔وہ، ہمارے وجود سے بے خبر ہیں۔ ہم، ہم ان کی کچھ جھلک دیکھ سکتے ہیں، ان کی آوازوں کا مجموعہ، ان کی حرکات و سکنات، مثلا ایک سائرن کی ٹھہر ٹھہر کر آنے والی آواز، غمگین، مدھم۔

کمرہ میں جلی ہوئی شکر کی خوشبو آرہی ہے، بھنی ہوئی مونگ پھلیوں کی خوشبو، چینی شوربوں کی، بھنے ہوئے گوشت کی، جڑی بوٹیوں کی، یاسمین کے پھولوں کی، گرد و خاک کی، اگربتی کی، جلتے ہوئے کوئلوں کی، یہاں آگ کو ٹوکریوں میں ایک سے دوسری جگہ لے جایا جاتا ہے، گلیوں اور سڑکوں پر بیچا جاتا ہے، شہر کی خوشبو دور دراز کے گاؤں کی خوشبو جیسی ہے، جنگل کی سی۔

میں نے اچانک اسے ایک سیاہ جامۂ غسل پہنے دیکھا۔ وہ بیٹھا ہوا تھا، وہسکی پی رہا تھا، سگریٹ پی رہا تھا۔

اس نے مجھے بتایا کہ میں سوگئی تھی، کہ اس نے غسل لیا تھا۔ مجھے نیند کے آنے کا بالکل پتہ ہی نہیں چلا۔ اس نے ایک چھوٹے میز پر رکھے ہوئے لیمپ کو روشن کیا۔

یہ ایک ایسا آدمی ہے جس کی اپنی ہی عادتیں ہیں، میں یکدم اس کے بارے میں سوچتی ہوں، وہ یقیناً اس کمرہ میں اکثر آتا ہوگا، یہ ایسا آدمی ہے

جو یقیناً بہت زیادہ پیار کرتا ہوگا، ایسا آدمی جو خوف زدہ ہے، یہ بہت زیادہ پیار کرتا ہوگا تاکہ اپنے خوف سے مقابلہ کر سکے۔ میں اسے کہتی ہوں کہ مجھے یہ خیال بہت اچھا لگتا ہے کہ اس کے پاس بہت سی عورتیں ہیں، کہ ان عورتوں میں سے ایک میں ہوں، ان سے قطعی مختلف نہیں۔ ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ میں نے کیا کہا ہے۔ اس کی نگاہ اچانک بدل جاتی ہے، بناوٹی، اذیت میں مبتلا، موت۔

میں اسے اپنے پاس آنے کو کہتی ہوں، میں اسے کہتی ہوں کہ وہ مجھ سے دوبارہ پیار کرے۔ وہ آتا ہے۔ اس کے انگلستانی سگریٹوں کی، مہنگے عطروں کی، شہد کی سی خوشبو مسحور کن ہے، اس کے جسم میں ریشم کی خوشبو رچی ہوئی ہے، تازہ اور خام ریشم کی پھلوں جیسی خوشبو، سونے کی خوشبو، وہ چاہت کے لائق ہے۔ میں اسے اِس خواہش کے بارے میں بتاتی ہوں۔ وہ مجھے کچھ دیر اور انتظار کرنے کو کہتا ہے۔ وہ مجھ سے باتیں کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ اسے فوراً ہی پتہ چل گیا تھا، دریا عبور کرتے ہوئے ہی، کہ میں اپنے پہلے عاشق کے بعد ہی ایسی ہوجاؤں گی، کہ مجھے پیار کرنا اچھا لگے گا، وہ کہتا ہے کہ وہ ابھی سے جانتا ہے کہ میں اُس سے بے وفائی کروں گی، اور یہ بھی کہ میں ان تمام لوگوں سے بے وفائی کروں گی جن سے میرے تعلقات ہوں گے۔ وہ کہتا ہے کہ جہاں تک اس کا تعلق ہے اپنی بدقسمتی کا باعث وہ خود ہی ہے۔ مجھے اپنے مستقبل کے بارے میں اس کا کہا سب کچھ سن کر بہت خوشی ہوئی اور میں

اسے یہ بتاتی بھی ہوں۔ وہ طیش میں آجاتا ہے، اس کے جذبات میں انتہائی تشدد ہے، وہ یکدم مجھ پر حملہ آور ہوجاتا ہے، وہ بچی کی، میری چھاتیوں کو کھانے لگتا ہے، وہ چیختا چلاتا ہے، وہ گالم گلوچ کرتا ہے۔ میں شدید لذت کی وجہ سے اپنی آنکھیں بند کرلیتی ہوں۔میں سوچتی ہوں: وہ اس کا عادی ہے، وہ زندگی میں یہی کچھ کرتا ہے، پیار، صرف یہی۔ اسکے ہاتھ ماہر ہیں، حیرت انگیز، کمال۔ میں بہت خوش قسمت ہوں، یہ ظاہر ہے، یہ تو ایسا ہے کہ جیسے یہ اسکا پیشہ ہو، نہ جانتے ہوئے بھی وہ سبھی کچھ بالکل ٹھیک طریقہ سے جانتا ہے جو اسے کرنا ہے، اور جو اسے کہنا ہے۔ وہ مجھے رنڈی اور فاحشہ کہہ کے پکارتا ہے، وہ مجھے کہتا ہے کہ میں اس کی اکلوتی محبت ہوں، اور یہی وہ بات ہے جو اسے کہنی چاہیئے، اور یہی چیز ہے جو بندہ کہتا ہے جب بندہ چیزوں کو خود سے ہی کہنے دیتا ہے، جب بندہ جسم کو آزادی دے دیتا ہے کہ وہ جو کچھ بھی چاہے اسے ڈھونڈے اسے پالے، اسے حاصل کرلے، اور پھر سب کچھ ٹھیک ہوجاتا ہے، کوئی گندگی نہیں بچتی، تمام گندگیاں چھپ جاتی ہیں، اور سب کچھ طوفان میں بہہ جاتا ہے، خواہش کے طوفان میں۔

شہر کا شور بہت قریب ہے، بہت ہی قریب، اتنا کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ شٹر کی لکڑی کو چھو رہا ہے۔ آوازیں ایسے سنائی دے رہی ہیں کہ جیسے لوگ کمرے کے اندر سے گزر رہے ہیں۔ میں اس شور میں، راہ گیروں کے

آنے جانے میں، اس کے جسم کو چمکارتی ہوں۔ سمندر، لامحدودیت، اکٹھی ہوتی ہے، دور جاتی ہے، واپس آتی ہے۔

میں نے اسے کہا تھا کہ وہ میرے ساتھ دوبارہ اور پھر دوبارہ کرے، میرے ساتھ وہی کرے۔ اور اس نے کیا۔ اس نے خون کی چکناہٹ میں کیا۔ اور یہ واقعی مرنے کی حد تک تھا، اور مرنے کی حد تک ہوتا رہا۔

اس نے ایک سگریٹ سلگایا اور مجھے دیا۔ اور بہت دھیمی آواز میں، میرے لبوں کے بہت قریب ہوکر، مجھ سے باتیں کیں۔

میں نے بھی اس سے بہت دھیمی آواز میں باتیں کیں۔

کیونکہ وہ خود نہیں جانتا، اس کی جگہ میں اس کے بارے میں کہتی ہوں، کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ اس کے اندر ایک اعلیٰ درجہ کی شائستگی ہے، یہ میں اسے اس کی جگہ بتاتی ہوں۔

اب شام پڑگئی ہے۔ وہ مجھے کہتا ہے کہ میں اس دوپہر کو پوری زندگی یاد رکھوں گی، حتی کہ اس وقت بھی جب میں اس کے نام اور اس کی شکل تک کو بھول چکی ہوں گی۔ میں اس سے پوچھتی ہوں کہ کیا یہ گھر مجھے یاد رہے گا۔ وہ مجھے کہتا ہے: اسے اچھی طرح سے دیکھ لو۔ میں گھر کو دیکھتی ہوں۔ میں اسے کہتی ہوں کہ یہ تو دوسرے گھروں جیسا ہی ہے۔ وہ کہتا ہے، ہاں، ہاں واقعی،

ہمیشہ کی طرح۔

میں اب بھی اس کا چہرہ دیکھ سکتی ہوں، اور مجھے اس کا نام بھی یاد ہے۔ میں سفیدی والی دیواریں بھی دیکھ سکتی ہوں، کینوس کا بنا ہوا پردہ جو تندور کی طرف کھلتا ہے، ایک اور محرابی دروازہ جو دوسرے کمرہ میں کھلتا ہے اور ایک آسمان کھلے باغیچہ میں بھی، جس کے پودے گرمی سے سوکھ چکے ہیں، باغیچہ کے ارد گرد آبی رنگ کے کنگوری جنگلے ہیں جیسے کہ سادیک کے بڑے مکان میں ہیں جو دریائے مکونگ کے کنارے پر ہے۔

یہ ایک سنسان اور تباہی کی جگہ ہے۔ وہ مجھ سے پوچھتا ہے کہ میں اسے بتاؤں کہ میں کس بارے میں سوچ رہی ہوں۔ میں اسے بتاتی ہوں کہ میں اپنی ماں کے بارے میں سوچ رہی ہوں، کہ وہ مجھے قتل کردے گی اگر اسے سچائی کا علم ہوگیا۔ میں دیکھتی ہوں کہ وہ کچھ کوشش کررہا ہے اور پھر وہ کہتا ہے، وہ کہتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ میری ماں کا یہ کہنے کا کیا مطلب ہے، وہ کہتا ہے: یہ بے عزتی ہے، وہ کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر شادی کا کوئی معاملہ ہوتا تو وہ اس خیال کو کبھی بھی نہ برداشت کرسکتا۔ میں اس کی طرف دیکھتی ہوں۔ وہ اپنی باری میری طرف دیکھتا ہے، وہ مجھ سے بہت فخر سے معذرت کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے: میں چینی ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ میں اس سے پوچھتی ہوں کہ کیا عموماً ایسے ہی ہوتا ہے

کہ بندہ افسردہ ہو جیسے کہ ہم ہیں۔ وہ کہتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے دن کے وقت پیار کیا ہے، اُس وقت جب گرمی عروج پر تھی۔ وہ کہتا ہے کہ بعد میں ہمیشہ دل آزاری ہوتی ہے۔ وہ مسکراتا ہے۔ کہتا ہے: خواہ لوگ ایک دوسرے سے محبت کریں یا نہ کریں، ہمیشہ ہی دل آزاری ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ رات آتے ہی ختم ہوجائے گی، جونہی رات ڈھلے گی۔ میں اسے کہتی ہوں کہ یہ صرف اس لئے نہیں ہے کہ ہم نے دن کے وقت پیار کیا ہے، کہ وہ غلطی کررہا ہے، میں نے محسوس کیا ہے کہ یہ افسردگی ایسی ہے جس کا مجھے انتظار تھااور جو میرے اپنے اندر سے آتی ہے۔ کہ میں ہمیشہ سے افسردہ رہی ہوں۔ کہ یہ افسردگی مجھے اپنی ان تصویروں میں بھی دکھائی دیتی ہے جو میرے بچپنے کی ہیں۔آج بھی، یہ پہچانتے ہوئے کہ یہ وہی افسردگی ہے جو ہمیشہ سے میرے ساتھ ہے، میں اس کو اپنا نام تک دے سکتی ہوں۔ کیونکہ یہ مجھ سے اتنا ملتی ہے، میں اسے بتاتی ہوں کہ آج یہ افسردگی میرے لئے تسکین ہے کیونکہ بالآخر اب میں اسی بدقسمتی میں پھنس گئی ہوں جس کی میری ماں میرے لئے ہمیشہ سے پیشین گوئی کرتی آئی ہے، جب وہ اپنی زندگی کے صحرا میں چیختی ہے۔ میں اُسے کہتی ہوں: میں ٹھیک طرح سے نہیں سمجھتی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے لیکن میں جانتی ہوں کہ یہ کمرہ وہی ہے جس کا مجھے انتظار تھا۔ میں جواب کا انتظار کیے بغیر بولے چلی جاتی ہوں۔ میں اسے بتاتی ہوں کہ میری ماں گرج کر وہی کچھ کہتی ہے جس کا اسے یقین ہوتا ہے،

خدا کے پیغمبروں کی طرح۔ وہ چیخ چیخ کر کہتی ہے کہ کسی چیز کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے، کبھی بھی نہیں، نہ کسی شخص سے، نہ کسی ریاست سے، نہ کسی خدا سے۔وہ مجھے بولتے ہوئے دیکھتا ہے، وہ مجھ پر سے اپنی نظریں نہیں ہٹاتا، وہ میرے ہونٹوں کو دیکھتا ہے جب میں بولتی ہوں، میں برہنہ ہوں، وہ مجھے چمکارتا ہے، شاید وہ میری باتیں نہیں سن رہا، مجھے علم نہیں۔ میں کہتی ہوں کہ میں اپنی موجودہ بدقسمتی کو ذاتی معاملہ نہیں سمجھتی۔ میں اسے بتاتی ہوں کہ صرف میری ماں کی تنخواہ سے کھانا پینا، پہننا اوڑھنا، بالفاظ دیگر زندہ رہنا، بہت ہی مشکل ہے۔ میرے لئے بولنا مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جارہا ہے۔ وہ کہتا ہے: تم گذارہ کیسے کرتے تھے؟ میں کہتی ہوں کہ ہم نے گھر سے باہر ہی زندگی گذاری ہے، کہ غربت نے ہمارے خاندان کی دیواروں کو گرادیا تھا اور ہم سب نے اپنے آپ کو گھر سے باہر پایا، ہرکوئی وہی کرتا ہوا جو وہ چاہتا۔ بے شرم تھے ہم۔ یہی وجہ ہے کہ میں یہاں تمہارے ساتھ ہوں۔ وہ میرے اوپر ہے، دوبارہ میرے اندر ڈوبا ہوا۔ ہم اسی طرح رہتے ہیں، ایک دوسرے سے جڑے ہوئے، باہر سے آتے ہوئے شہر کے شور میں کراہتے ہوئے، ہمیں ابھی تک شور سنائی دے رہا ہے۔ اور پھر ہمیں شور سنائی نہیں دیتا۔

جسم پر دیئے ہوئے بوسے رلا دیتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ وہ تسکین دیتے ہیں۔ خاندان میں میں نہیں روتی۔ لیکن اس دن اس کمرہ میں یہ آنسو میرے

ماضی اور میرے مستقبل دونوں کے لئے مرہم ثابت ہوتے ہیں۔ میں اسے بتاتی ہوں کہ ایک دن میں اپنی ماں کو چھوڑ دوں گی، کہ ایک دن میرے پاس میری ماں کے لئے بھی محبت نہیں رہے گی۔ میں روتی ہوں۔ وہ اپنا سر میرے اوپر رکھتا ہے اور مجھے روتا دیکھ کر خود بھی رونے لگتا ہے۔ میں اسے بتاتی ہوں کہ بچپن میں ہی میری ماں کے دکھوں نے میرے خوابوں کی جگہ لے لی تھی۔ کہ میرے خواب میری ماں تھی، نہ کہ کرسمس کے درخت، ہمیشہ صرف وہ، ماں جس کی غربت نے زندہ کھال ادھیڑ دی تھی، یا پھر وہ جو پاگلوں کی طرح صحرا میں بول رہی ہے، یا وہ جو کھانا ڈھونڈ رہی ہے یا وہ جو مسلسل اپنے اوپر بیتی ہوئی چیزوں کے بارے میں باتیں کرتی ہے، روبے کے شہر والی ماری لگراں، وہ اپنی معصومیت کی باتیں کرتی ہے، اپنی بچت کی، اپنی امیدوں کی۔

پردوں میں سے شام اندر داخل ہورہی ہے۔ شور بڑھ گیا ہے۔ اب وہ زیادہ تیز ہوگیا ہے، دبا دبا نہیں۔ سرخ بلبوں والے کھمبوں میں روشنی آچکی ہے۔

ہم فلیٹ سے باہر نکل آتے ہیں۔ مردوں والا کالے فیتے والا ہیٹ میں اپنے سر پر رکھ لیتی ہوں، سنہرے جوتے، گہرے رنگ والی سرخی، ریشمی فراک۔ میری عمر بڑھ گئی ہے۔ مجھے یکدم اس کا احساس ہوتا ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے، وہ کہتا ہے: تم تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔

ایک نئی کتاب:

عورت کتھا

غیر ملکی زبانوں کے خواتین ادیبوں کے افسانے

(اردو تراجم)

انتخاب و ترتیب: یاسر حبیب

اس کتاب میں براعظم افریقہ، ایشیا، جنوبی امریکا اور آسٹریلیا کی ممتاز خواتین ادیبوں کے 44 افسانے شامل ہیں۔

کتاب کی خریداری کے لیے رابطہ کریں۔

سٹی بک پوائنٹ، نوید اسکوائر، اردو بازار، کراچی۔
رابطہ نمبر 03122306716 (واٹس ایپ یا کال)

پیدل پٹڑی پر چلتی ہوئی بھیڑ، ہر سمت میں آ جا رہی ہے، آہستہ رو یا تیز رفتار، اپنا راستہ بناتی ہوئی، آوارہ کتوں کی طرح خارشی، بھکاریوں کی طرح اندھی، یہ چین کی ایک بھیڑ ہے، اب بھی آج کی خوشحالی کی تصویروں میں وہ مجھے دکھائی دیتی ہے، ان لوگوں کا اکٹھے پیدل چلنے کا طریقہ، بغیر کسی بے صبری کے، ایسے کہ جیسے بھیڑ میں بھی وہ اکیلے ہیں، خوشی کے بغیر، یوں لگتا ہے، غمی کے بغیر، بغیر کسی تجسّس کے، وہ چلے جا رہے ہیں بغیر کسی منزل کے، بغیر کسی ارادہ کے، صرف چل رہے ہیں اِس راستہ پر بجائے اُس راستہ پر، اکیلے اور بھیڑ میں، اکیلے میں بھی کبھی اکیلے نہیں، بھیڑ میں ہمیشہ اکیلے۔

ہم کئی منزلوں والے چینی ریستورانوں میں سے ایک میں جاتے ہیں، یہ ریستوران پوری کی پوری عمارت میں پھیلے ہوتے ہیں، وہ بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹ سٹوروں کی طرح ہوتے ہیں، بیرکوں کی طرح، بالکونیوں اور چبوتروں سے وہ شہر کی طرف کھلتے ہیں۔ ان جگہوں سے آنے والے شور کا یورپ میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، ویٹر چیخیں مار مار کر آرڈر دیتے ہیں اور وہی آرڈر واپس باورچی خانوں سے چیخوں کی شکل میں واپس آتے ہیں۔ ان ریستورانوں میں کوئی بولتا نہیں۔ چبوتروں پر چینی آرکسٹرا ہوتا ہے۔ ہم سب سے زیادہ خاموش والی منزل پر جاتے ہیں، یورپین منزل، یہاں فہرست طعام تو وہی ہے لیکن چیخ و پکار کم ہوتی ہے۔ شور وغل دبانے کے لئے یہاں پر پنکھے ہیں اور بھاری بھاری پردے۔

میں اُس سے پوچھتی ہوں کہ وہ مجھے بتائے کہ اس کا باپ امیر کیسے بنا، کس طریقہ سے۔ وہ کہتا ہے کہ پیسوں کے بارے میں باتیں کرنے سے وہ بیزار ہوجاتا ہے، لیکن اگر میں اصرار کرتی ہوں تو وہ بڑی خوشی سے مجھے اپنے باپ کی دولت کے بارے میں وہ کچھ بتائے گا جو وہ جانتا ہے۔ یہ سب کچھ چولون میں شروع ہوا، مقامی لوگوں کے لئے مکان بنانے سے۔ اس نے ایسے تین سو مکان بنوائے۔ کئی گلیاں اس کی ملکیت میں ہیں۔ وہ فرانسیسی زبان پیرس میں مقیم لوگوں کے لہجے میں بولتا ہے جو کچھ کچھ بناوٹی لگتا ہے، وہ پیسے کے بارے میں مکمل آسانی سے باتیں کرتا ہے۔ باپ کے پاس کئی عمارتیں تھیں جو اس نے جنوبی چولون میں تعمیر کے لئے زمینیں خریدنے کے لئے بیچ دیں تاکہ وہ وہاں گھر بنائے۔ چاولوں والے کھیت بھی بیچ دیئے گئے تھے، اس کا خیال ہے، سادیک میں۔ میں اس سے وباؤں کے بارے میں سوالات کرتی ہوں۔ میں اس سے کہتی ہوں کہ میں نے گلیوں کی گلیاں دیکھی ہیں جہاں یکدم مکان بند کردیئے گئے ہیں، شام کو کھلے صبح کو بند، دروازوں اور کھڑکیوں کو کیل ٹھونک کر بند کردیا گیا، طاعون کی وبا کی وجہ سے۔ وہ مجھے بتاتا ہے کہ یہاں وبا کم ہے، کہ یہاں بنسبت دیہی علاقوں کے، چوہوں کو زیادہ دفعہ ختم کردیا جاتا ہے۔ اور پھر وہ یکدم مجھے ان مکانوں کے بارے میں کہانی سناتا ہے۔ ان کی قیمت ذاتی گھروں اور بڑی رہائشی عمارتوں کی نسبت بہت کم ہے اور یہ عام محلوں کے لوگوں کی ضروریات علیحدہ گھروں سے بہتر

انداز میں پوری کرتے ہیں۔ یہاں کے لوگ ایک دوسرے کے قریب رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں، خاص طور پر غریب لوگ، وہ جو دیہی علاقوں سے یہاں سے آئے ہیں، وہ گھروں سے باہر رہنا، گلیوں میں رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اور غریب لوگوں کی عادتوں کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ اس کے باپ نے ابھی ابھی مکانوں کا سلسلہ تعمیر کروایا ہے جن میں چھتوں والی بالکونیاں ہیں جو گلی کی طرف کھلتی ہیں۔ اس وجہ سے گلیاں روشن اور خوشگوار ہوجاتی ہیں۔ لوگ اپنے دن بالکونیوں میں گزارتے ہیں۔ اور اگر گرمی زیادہ ہو تو وہ وہاں سو بھی جاتے ہیں۔ میں اسے کہتی ہوں کہ میں خود بھی بالکونی میں رہنا پسند کرتی، کہ جب میں بچی تھی تو میری آرزو تھی کہ میں بھی کمرے سے باہر سوؤں۔

اچانک مجھے درد سا محسوس ہوتا ہے۔ بہت ہلکا سا، تقریباً نہ ہونے کے برابر۔ یہ میرے دل کی دھڑکن تھی جو وہاں منتقل ہوگئی تھی، تیز اور تازہ زخم میں جو اس نے مجھے لگایا تھا، اس نے، وہ جو مجھ سے باتیں کررہا ہے، وہ جس نے دوپہر کی لذت دی تھی۔ مجھے سنائی نہیں دیتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، میں نے سننا بند کردیا ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے، وہ خاموش ہوجاتا ہے۔ میں اسے کہتی ہوں کہ وہ اپنی باتیں جاری رکھے۔ وہ یہی کرتا ہے۔ میں دوبارہ سننا شروع کردیتی ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ اسے پیرس بہت یاد آتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ میں پیرس کی عورتوں سے بہت مختلف ہوں، بہت کم بامروّت۔ میں اسے کہتی ہوں

کہ یہ مکانوں کا کاروبار یقیناً کوئی خاص منافع بخش تو نہیں ہوگا۔ وہ مجھے کوئی جواب نہیں دیتا۔

اپنی اس آشنائی کے پورے عرصہ کے دوران، ڈیڑھ سال، ہم اسی طریقہ سے آپس میں باتیں کریں گے، ہم نے کبھی بھی اپنے بارے میں باتیں نہیں کریں گے۔ شروع شروع کے دنوں ہی سے ہمیں علم ہوگیا ہے کہ ہمارا ایک مشترکہ مستقبل ہونے کے کوئی امکانات نہیں ہیں، اس لئے ہم مستقبل کے بارے میں کبھی بھی باتیں نہیں کریں گے، ہم روز مرہ کی زندگی کے مسائل کے بارے میں ہی باتیں کریں گے، باری باری، ایک کے بعد دوسرا۔

میں نے اس سے کہا کہ اس کا فرانس میں رہنا اس کے لئے مہلک ثابت ہوا۔ وہ مجھ سے متفق ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پیرس میں اس نے سب کچھ خریدا، عورتیں بھی، دوست یار بھی، اپنے خیالات بھی۔ وہ عمر میں مجھ سے بارہ سال بڑا ہے اور یہ چیز اسے خوف دلاتی ہے۔ میں اس کے بولنے کے انداز کو غور سے سنتی ہوں، لفظوں کے استعمال میں غلطیوں کو، اس کے پیار کرنے کے انداز کو بھی، ان میں ایک طرح کا تھیٹرپن ہے جو کہ بیک وقت مصنوعی بھی ہے اور مخلص بھی۔

میں اسے کہتی ہوں کہ میں اسے اپنے خاندان کے لوگوں سے ملواؤں گی، وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہے اور میں ہنستی ہوں۔

وہ اپنے احساسات کا اظہار مضحکہ خیز نقالی کے بغیر نہیں کرسکتا۔ میں سمجھ جاتی ہوں کہ اُس میں اپنے باپ کی مرضی کے خلاف میرے ساتھ محبت کرنے کی ہمّت نہیں ہے، مجھے پانے کی، مجھے یہاں سے کہیں دور لے جانے کی۔ وہ اکثر رونا شروع کردیتا ہے کیونکہ اس میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ خوف پر غلبہ پاکر محبت کرے۔ میں ہوں اس کی بہادری، اور اس کے باپ کی دولت، اس کی بزدلی۔

جب بھی میں اپنے بھائیوں کا ذکر کرتی ہوں تو اس پر ایک خوف سا طاری ہوجاتا ہے، یوں لگتا ہے جیسے اس کا نقاب اتار دیا گیا ہو۔ وہ سمجھتا ہے کہ میرے ارد گرد کے تمام لوگ اس کی طرف سے میرے ساتھ شادی کی پیشکش کا انتظار کررہے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ میرے خاندان کی نظروں میں وہ پہلے ہی گرچکا ہے، اور اس کے مزید گرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، اور نتیجتاً وہ مجھے کھودے گا۔

وہ مجھے بتاتا ہے کہ پیرس میں وہ ایک بزنس سکول میں پڑھنے کے لئے گیا تھا، بالآخر وہ سچ بولتا ہے، کہ اس نے پڑھائی میں محنت نہیں کی، کہ اس کے باپ نے اسے پیسے بھیجنا بند کردیا، اور اس نے اسے واپسی کا ٹکٹ بھجوایا اور یوں مجبوراً اسے فرانس کو چھوڑنا پڑا۔ اس کی یہ واپسی ہی اس کا المیہ ہے۔ اس نے اس بزنس سکول میں پڑھائی کو مکمل نہیں کیا۔ وہ کہتا ہے کہ اُس کا

ارادہ ہے کہ وہ یہاں سے ہی خط و کتابت کے ذریعہ اپنی پڑھائی مکمل کرے۔

خاندان کے ساتھ ملاقاتیں چولون میں پُرتکلف کھانوں سے شروع ہوئیں۔ جب میری ماں اور میرے بھائی سائیگون آئے تو میں نے اس سے کہا کہ وہ انہیں اُن شاندار چینی ریستورانوں میں دعوت دے جن سے وہ ناواقف ہیں اور جہاں وہ پہلے کبھی نہیں گئے۔

شام کے وقت کی یہ تمام ملاقاتیں ایک ہی طرح سے ہوتیں۔ میرے بھائی کھانا ٹھونستے ہیں اور وہ اُس سے کبھی بھی مخاطب نہیں ہوتے، وہ اُس کی طرف دیکھتے بھی نہیں۔ وہ اسے دیکھ نہیں سکتے۔ اگر وہ یہ کرسکتے، اسے دیکھنے کی کوشش، تو وہ اس قابل بھی ہوتے کہ وہ اپنی پڑھائی کرسکیں، کہ وہ معاشرے میں زندگی گذارنے کے بنیادی اصولوں کی پیروی کریں۔ ان کھانوں کے دوران صرف میری ماں بولتی ہے، وہ بہت کم بولتی ہے، خاص طور پر شروع شروع میں، وہ لائے گئے کھانوں کے بارے میں چند جملے کہتی ہے، کھانے کی بے تحاشا مہنگائی پر، اور پھر وہ خاموش ہوجاتی ہے۔ چینی مرد، پہلی دو دعوتوں کے دوران، وہ ہمت کرکے پانی میں کود پڑتا ہے، پیرس میں اپنے معرکوں کے بارے میں باتیں کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن بے سود۔ یہ تو یوں تھا کہ جیسے اس نے کوئی بات ہی نہیں کی، جیسے کہ کسی نے اس کی بات کو سُنا ہی نہیں۔ اس کی یہ کوشش خاموشی میں ڈوب جاتی ہے۔ میرے بھائی بھی متواتر کھانا ٹھونس رہے ہیں۔ وہ کھانا ایسے ٹھونس رہے ہیں کہ میں نے کبھی

کسی شخص کو بھی ایسے ٹھونستے ہوئے نہیں دیکھا۔

چینی مرد کھانے کا بل ادا کرتا ہے۔ وہ پیسوں کو گنتا ہے۔ وہ انہیں پرچ میں رکھ دیتا ہے۔ تمام لوگ دیکھ رہے ہیں۔ پہلی دفعہ، مجھے یاد ہے، وہ ستتر پیاستروں کی ایک قطار لگا دیتا ہے۔ میری ماں کو قہقہوں کا دورہ پڑنے والا ہے۔ تمام لوگ جانے کی غرض سے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ کوئی شکریہ نہیں، کسی کی طرف سے بھی۔ وہ کبھی بھی اچھی ضیافت کے لئے شکریہ نہیں کہتے، نہ ہی، صبح بخیر اور نہ ہی الوداع، نہ ہی احوال پرسی، کوئی کبھی بھی ایک دوسرے کو کچھ نہیں کہتا۔

میرے بھائی اس سے کبھی مخاطب نہیں ہوں گے۔ یہ تو ایسے تھا کہ جیسے وہ انہیں دکھائی ہی نہیں دیتا تھا، کہ وہ ان کے لئے اتنا ٹھوس نہیں تھا کہ وہ اسے محسوس کریں، اُسے دیکھیں، اس کی باتیں سنیں۔ یہ اس لئے کہ وہ میرے پاؤں کے نیچے ہے، یہ کہ قدرتی طور پر یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ مجھے اس سے کوئی محبت نہیں ہے، کہ میں اس کی دولت کی وجہ سے اس کے ساتھ ہوں، کہ میں اس سے محبت نہیں کرسکتی، کہ یہ تو ناممکن ہے، کہ وہ میرے کسی قسم کے سلوک کو بھی برداشت کرلے گا اور وہ کبھی بھی میری محبت کونہیں ٹھکرائے گا۔ اس لئے، کہ وہ ایک چینی ہے، کہ وہ ایک گورا آدمی نہیں ہے۔ جس طریقہ سے میرا یہ بڑا بھائی چپ رہتا ہے اور میرے عاشق کے وجود کو نظر انداز کرتا ہے، ایسے ہی یقین کامل کی وجہ سے ہے اور یہ ایک معیار کی طرح عمل کرتا

ہے۔ ہم تمام بڑے بھائی کے اس معیار کو اس عاشق کی بنسبت اپناتے ہیں۔ میں بھی، ان کی موجودگی میں، اس سے بات نہیں کرتی۔ اپنے خاندان کی موجودگی میں مجھے اس سے کبھی مخاطب نہیں ہونا چاہیئے۔ بجز اس کے کہ جب کبھی میں اس کو اُن کی طرف سے کوئی پیغام دیتی ہوں۔ مثال کے طور پر، کھانے کے بعد، جب میرے بھائی مجھے کہتے ہیں کہ وہ ''لاسورس'' (چشمہ) میں جاکر پینا اور ناچنا چاہتے ہیں، تو میں ہی ہوں جو اُسے کہتی ہوں کہ ہم لوگ لاسورس میں جاکر پینا اور ناچنا چاہتے ہیں۔ پہلے تو وہ یوں ظاہر کرتا ہے کہ جیسے اس نے میری بات کو سنا ہی نہ ہو۔ اور مجھے، بڑے بھائی کی منطق کے تحت، مجھے یہ ہرگز نہیں کرنا چاہیئے کہ میں اس بات کو دہراؤں جو میں نے ابھی ابھی چینی مرد کے ساتھ کی ہے۔ مجھے اس سے دوبارہ نہیں پوچھنا چاہیئے کیونکہ اگر میں نے یہ کیا تو یہ ایک غلطی ہوگی، چونکہ مجھے اس کی شکایت پر اس کی سطح پر اترنا پڑے گا۔ بالآخر اسے مجھے جواب دینا پڑتا ہے۔ دھیمی آواز میں، جیسے کہ ہم دونوں اکیلے ہیں، وہ کہتا ہے کہ وہ کچھ لمحے میرے ساتھ اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہے۔ وہ اذیت کو ختم کرنے کے لئے یہ کہتا ہے۔ لیکن پھر مجھے ظاہر کرنا ہے کہ جیسے میں نے اس کی بات ٹھیک طرح نہیں سنی، ایک مزید نمک حرامی، جیسے کہ اس کی اس بات کا مقصد ناپسندیدگی کا اظہار ہے، کہ اس کے خلاف میرے بڑے بھائی کے رویے کی اعلانیہ ملامت ہے، اس لئے ابھی بھی مجھے اس کو کوئی جواب نہیں دینا چاہیئے۔ وہ، وہ ابھی بھی،

اپنی بات جاری رکھتا ہے، وہ مجھ سے کہتا ہے، وہ جسارت کرتا ہے: آپ کی امی تھک چکی ہیں، ان کی طرف دیکھئے تو۔ یہ حقیقت ہے کہ میری ماں پر چولون کے ان شاہانہ چینی کھانوں کے بعد غنودگی چھا جاتی ہے۔ لیکن میں اب بھی کوئی جواب نہیں دیتی۔ اور پھر مجھے بڑے بھائی کی آواز سنائی دیتی ہے، وہ کچھ کہتا ہے، ایک چھوٹا سا جملہ، تلخ، حتمی۔ میری ماں اس کے بارے میں کہا کرتی تھی: تم تینوں میں، وہی ہے جسے بولنا آتا ہے۔ اپنا جملہ ختم کرنے کے بعد میرا بھائی انتظار کرتا ہے۔ سب کچھ رک جاتا ہے، میں اپنے عاشق کے خوف کو محسوس کر لیتی ہوں، یہ وہی ہے جو میرے چھوٹے بھائی کا ہے۔ چینی آدمی اپنے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ ہم لاسورس جاتے ہیں۔ میری ماں بھی لاسورس جاتی ہے، وہ لاسورس جا کر سو جاتی ہے۔

میرے بڑے بھائی کی موجودگی میں وہ میرا عاشق نہیں رہتا۔ اس کا وجود تو ہوتا ہے لیکن وہ میرے لئے کچھ نہیں ہوتا۔ وہ ایسے ہو جاتا ہے جیسے کہ وہ کوئی جلی ہوئی جگہ ہو۔ میری خواہش میرے بڑے بھائی کا حکم مانتی ہے، اور میرے عاشق کو رد کرتی ہے۔ جب کبھی میں ان دونوں کو اکٹھے دیکھتی ہوں تو مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اس منظر کو میں کبھی بھی برداشت نہیں کر سکوں گی۔ میرے عاشق کو بالکل اسی کمزور جسم، اسی کمزوری میں مسترد کیا جاتا ہے، جس سے مجھے بے انتہا لذت ملتی ہے۔ میرے بھائی کے سامنے وہ ایک ناقابل

بیان بے عزتی میں تبدیل ہوجاتا ہے، وجہِ رسوائی جسے چھپانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں اپنے بھائی کے خاموش احکام کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ اگر معاملہ میرے چھوٹے بھائی کا ہوتو پھر ہاں۔ جب معاملہ میرے عاشق کا ہوتو میں اپنے خلاف کچھ بھی کرنے سے بے بس ہوں۔ اب اس چیز کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے چہرے پر ریاکاری دکھائی دیتی ہے، کسی کی غیرمتوجہ نظریں جو کسی دوسری طرف دیکھ رہا ہے، جس کے ذہن میں کچھ اور خیالات ہیں، لیکن اس کے باوجود، اس کے بھینچے ہوئے جبڑوں سے پتہ چلتا ہے، کہ وہ برہم ہے اور اسے یہ برداشت کرتے ہوئے تکلیف ہورہی ہے، اس توہین کو، صرف اچھا کھانا کھانے کے لئے، ایک مہنگے ریستوران میں، جوکہ ایسی چیز ہے کہ جو فطرتی ہونی چاہیئے۔ اس یادداشت کے ساتھ ساتھ شکاری کی رات کی ہولناک تمتماہٹ۔ روشنی یہ خطرے کی تشویش کی کرخت آواز دیتی ہے، بچے کی چیخ۔

لاسورس میں بھی کوئی اس سے بات نہیں کرتا۔

تمام لوگ مارٹل پیرئے منگواتے ہیں۔ میرے دونوں بھائی اپنی فوراً پی لیتے ہیں اور وہ دونوں ایک اور منگواتے ہیں۔ میری ماں اور میں ان کو اپنی دے دیتے ہیں۔ میرے بھائیوں کو بہت جلد ہی نشہ چڑھ جاتا ہے۔ وہ ابھی بھی اس سے تو باتیں نہیں کرتے، لیکن وہ خامیاں نکالنا شروع کردیتے ہیں۔

خاص طور پر چھوٹا بھائی۔ وہ شکایت کرتا ہے کہ یہ جگہ بہت افسردہ کن ہے اور یہ کہ یہاں میزبان خواتین بھی نہیں ہیں۔ ہفتہ کے دوران لاسورس میں بہت کم لوگ آتے ہیں۔ اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ میں ناچتی ہوں۔ اپنے عاشق کے ساتھ بھی میں ناچتی ہوں۔ میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ کبھی نہیں ناچتی، میں اس کے ساتھ کبھی نہیں ناچی۔ ایک مضطرب کرنے والے خطرے کا احساس ہے جو مجھے ایسا کرنے سے روکتا ہے، ایک بدستور کشش کا احساس جسے وہ تمام لوگوں پر عمل میں لاتا ہے، ہمارے جسموں کی قربت کے خطرے کا احساس۔

ہم ایک دوسرے سے حیرت انگیز حد تک مشابہت رکھتے ہیں، خاص طور پر ہمارے چہرے۔

چولون والا چینی مجھ سے بات کرتا ہے، اس کے آنسو نکلنے والے ہیں، وہ کہتا ہے: میں نے ان لوگوں کا کیا بگاڑا ہے؟ میں اسے کہتی ہوں کہ اسے پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں، کہ یہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے، ہمارے اپنے درمیان بھی، زندگی کے تمام حالات میں۔

جب ہم فلیٹ میں واپس جاتے ہیں تو میں اسے سمجھاتی ہوں۔ میں اسے بتاتی ہوں کہ میرے بڑے بھائی کا تشدد، سرد اور توہین آمیز رویہ، وہ ہمیشہ ہر اُس چیز کے ساتھ ہوتا ہے جو ہمیں پیش آتی ہے، جو کچھ بھی ہماری طرف آتا

ہے۔ اس کی پہلی حرکت قتل کرنا ہے، زندگی سے خارج کرنا، زندگی پر کنٹرول کرنا، تحقیر کرنا، شکار کرنا، تکلیف دینا ہے۔ میں اسے کہتی ہوں کہ اسے خوف زدہ نہیں ہونا چاہیئے، کہ اسے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص ہے جس سے بڑا بھائی ڈرتا ہے، جس کے سامنے، حیرت کی بات ہے، اس پر گھبراہٹ طاری ہوجاتی ہے، تو وہ میں ہوں۔

نہ کبھی صبح بخیر، نہ شب بخیر، نہ ہی نیا سال مبارک۔ شکریہ کبھی نہیں۔ کبھی بات چیت نہیں، کبھی بات چیت کی ضرورت نہیں۔ سب کچھ خاموش، مبہم اور دور۔ یہ خاندان پتھر کا بنا ہوا ہے، پتھر میں تبدیل ہوچکا ہے، اتنی موٹی تہہ میں کہ اس تک رسائی ہی نہیں ہے۔ ہر روز ہم ایک دوسرے کو قتل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، قتل کرنے کی۔ صرف یہی نہیں کہ ہم ایک دوسرے سے گفتگو نہیں کرتے بلکہ ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے بھی نہیں۔ جب کوئی آپ کی طرف دیکھتا ہے تو آپ نہیں دیکھ سکتے۔ دیکھنے کا مطلب ہے کسی طرف، کسی کی طرف تجسس کی حرکت، اس کا مطلب ہے اپنے آپ کو نیچا کرنا۔ جس شخص کی طرف آپ دیکھتے ہیں وہ اس قابل نہیں ہے کہ اس کی طرف دیکھا جائے۔ دیکھنا ہمیشہ وقار کو گرانے کے مترادف ہے۔ لفظ گفتگو دل و دماغ سے نکال دیا گیا ہے۔ میرے خیال میں یہی وہ لفظ ہے جو شرم اور تکبر کو بہتر طریقے سے بیان کرتا ہے۔ کوئی بھی سماجی رابطہ، خواہ وہ خاندانی ہو یا کچھ اور، ہمارے لئے نفرت انگیز ہے، ذلت آمیز۔ جو چیز ہمیں اکٹھا کرتی

ہے وہ ہے زندگی کو گزارنے کی بنیادی شرم۔ یہی ہے جہاں ہم اپنی مشترکہ زندگی کی گہرائیوں میں ہیں، کہ ہم تینوں ایک خوش دل والے شخص کے بچے ہیں، اپنی ماں کے، جسے معاشرے نے قتل کر دیا ہے۔.ہم اس معاشرے سے ہیں جس نے میری ماں کو ناامیدی کی حد تک گرا دیا ہے۔اس وجہ کی بنا پر جوکہ ہماری ماں کے ساتھ کیا گیا ہے، ماں جوکہ اتنی ہر دلعزیز ہے، اتنی بھروسہ کرنے والی، ہمیں زندگی سے نفرت ہے،ہمیں اپنے آپ سے نفرت ہے۔

ہماری ماں اس امر کی پیش بینی نہیں کر سکتی تھی کہ اس کی ناامیدی کو دیکھتے ہوئے، ہمارے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ میں خصوصاً لڑکوں کی بات کر رہی ہوں، بیٹوں کی۔ اگر وہ اس چیز کی پیش بینی کر بھی سکتی تو وہ اس چیز کے بارے میں کیسے خاموش رہ سکتی تھی جو اس کی اپنی زندگی کی سرگذشت بن چکی تھی؟ وہ کیسے کر سکتی تھی کہ اس کا چہرہ، اس کی نگاہیں، اس کی آواز، اس کی محبت جھوٹ بولیں؟ وہ مر سکتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو ختم کر سکتی تھی۔ اپنے ناقابل برداشت سماج کو توڑ سکتی تھی۔ یہ کہ بڑا بیٹا دونوں چھوٹوں سے بالکل علیحدہ کیا جائے۔لیکن اس نے یہ نہیں کیا۔ وہ عاقبت اندیش نہیں تھی، وہ بے فکر تھی، غیر ذمہ دار۔ وہ یہ سب کچھ تھی۔ ہم تینوں نے اُس سے محبت سے بھی بڑھ کر محبت کی۔ اس وجہ سے بھی کہ وہ یہ سب کچھ نہیں کر سکتی تھی، کہ وہ خاموش نہیں رہ سکتی تھی، چھپ نہیں سکتی تھی، جھوٹ نہیں بول سکتی تھی، ہم تینوں ایک دوسرے سے اتنا مختلف ہونے کے باوجود، اس کے ساتھ ایک ہی انداز

میں محبت کی تھی۔

یہ سلسلہ بہت عرصہ تک چلتا رہا۔ سات سال تک۔ جب یہ شروع ہوا تو ہم دس سال کے تھے۔ اور پھر ہم بارہ سال کے ہوئے۔ اور پھر تیرہ سال۔ اور پھر چودہ سال، پندرہ سال۔ اور پھر سولہ سال، سترہ سال۔

یوں ہوتے ہوتے ایک عمر گذر گئی، سات سال۔ اور پھر آخر میں امید سے کنارہ کشی کرلی گئی، اسے چھوڑ دیا گیا۔ سمندر کے خلاف مقابلہ کو بھی ترک کردیا گیا۔ ورانڈے کے سائے میں بیٹھے ہم سیام کے پہاڑ کو دیکھتے ہیں جو سورج کی تیز روشنی میں گہرے رنگ کا لگتا ہے، کالا کالا سا۔ بالآخر ماں پُرسکون ہوجاتی ہے، خاموش۔ ہم، اس کے بچے، سُورما ہیں، ناامید۔

چھوٹا بھائی دسمبر 1942 میں فوت ہوگیا، جاپانی قبضہ کے دوران۔ میں نے سائیگون کو 1931 میں ہائی سکول ختم کرتے ہوئے چھوڑ دیا تھا۔ اس نے مجھے ان میں صرف ایک مرتبہ خط لکھا۔ مجھے کبھی نہیں پتہ چلا کہ کیوں۔ خط رسمی انداز میں لکھا ہوا تھا، اور بڑی احتیاط سے، بغیر کسی غلطی کے، خوش خطی میں لکھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ تمام لوگ خیریت سے تھے اور یہ کہ سکول میں اس کی پڑھائی ٹھیک جارہی تھی۔ یہ پورے دو صفحوں پر مشتمل ایک لمبا سا خط تھا۔ میں نے اس کے بچپن کی خوش خطی کو پہچان لیا۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا

کہ اس کے پاس فلیٹ تھا، ایک کار، اس نے کار کا ماڈل بھی بتایا تھا۔ کہ اس نے دوبارہ ٹینس کھیلنا شروع کردیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ خیریت سے تھا، سب کچھ ٹھیک تھا۔ اور یہ کہ وہ مجھے ایسے گلے لگا رہا تھا جتنا کہ وہ مجھ سے پیار کرتا تھا، بہت زور سے۔ اس نے نہ تو جنگ کے بارے میں بات کی اور نہ ہی بڑے بھائی کے بارے میں۔

میں اکثر اپنے بھائیوں کے بارے میں ایسے بات کرتی ہوں جیسے کہ وہ ایک مجموعہ تھے، جیسے وہ کرتی تھی، میری ماں۔ میں کہتی ہوں: میرے بھائی، وہ بھی خاندان سے باہر لوگوں کو کہتی! میرے بیٹے۔ وہ ہمیشہ توہین آمیز انداز میں اپنے بیٹوں کی طاقت کے بارے میں بات کرتی۔ باہر کے لوگوں کے لئے وہ تفصیلات میں نہیں جاتی تھی، وہ یہ نہیں کہتی تھی کہ بڑا بیٹا دوسرے بیٹے سے بہت زیادہ طاقت ور ہے، وہ کہتی کہ وہ اتنا ہی طاقتور ہے جتنے کہ اس کے بھائی، شمالی علاقے کے رہنے والے کسان۔ وہ اپنے بیٹوں کی طاقت پر بہت فخر کیا کرتی تھی جیسے کہ وہ اپنے بھائیوں کی طاقت پر فخر کرتی تھی اور کیا کرتی تھی۔ اپنے بڑے بیٹے کی طرح وہ کمزور لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی۔ میرے چولون کے عاشق کے بارے میں وہ وہی کچھ کہتی تھی جو کہ بڑا بھائی۔ میں اُن لفظوں کو یہاں نہیں لکھوں گی۔ ان لفظوں کا تعلق صحرا میں پائے گئے مردہ جانوروں کے ساتھ تھا۔ میں کہتی ہوں: میرے بھائی، کیونکہ میں بھی ایسے ہی کہا کرتی تھی۔ لیکن یہ بعد کی بات ہے، جب چھوٹا بھائی بڑا

ہوگیا اور شہید کر دیا گیا۔

صرف یہی نہیں کہ ہمارے خاندان میں کسی قسم کا جشن نہیں منایا جاتا تھا، نہ کرسمس کا درخت، نہ کوئی کڑھا ہوا رومال، نہ کوئی پھول، کبھی نہیں۔ نہ ہی کوئی موت، نہ کوئی جنازہ، نہ کوئی یادیں۔ اکیلے صرف وہی تھی۔ بڑا بھائی ہمیشہ قاتل ہی رہے گا۔ چھوٹا بھائی اس بڑے بھائی کی وجہ سے مر جائے گا۔ میں تو وہاں سے نکل گئی، میں نے اپنے آپ کو وہاں سے اکھاڑ لیا۔ موت تک ماں صرف بڑے بھائی کی ہی تھی۔

اُس دور میں، چولون والا دور، تصویر والا، عاشق والا دور، میری ماں کو پاگل پنے کا دورہ پڑا۔ اس کو چولون میں پیش آنے والے واقعات کا قطعی علم نہیں۔ لیکن میں دیکھتی ہوں کہ وہ میری ٹوہ لگاتی ہے، اسے کسی بات کا شبہ ہے۔ وہ اپنی بیٹی کو جانتی ہے، اس بچی کو، کچھ عرصہ سے اس بچی کے اردگرد ایک اجنبیت سی چھا گئی ہے، ایک بے گانگی جوکہ حالیہ لگتی ہے، جو توجہ کی حامل ہے، وہ عادت سے بھی زیادہ آہستہ بولتی ہے، اور وہ جو پہلے ہر چیز میں تجسس ظاہر کرتی تھی، اب وہ غائب دماغ ہوگئی ہے، اس کی نظریں بدل گئی ہیں، وہ اپنی ہی ماں کی تماشائی بن گئی ہے، اپنی ماں کی ناخوشی کی، بلکہ یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ اس کا اختتام دیکھ رہی ہو۔ میری ماں کی زندگی میں یک دم وحشت چھا جاتی ہے۔ اس کی بیٹی کو ایک خوفناک خطرہ لاحق ہے، اس کی کبھی بھی شادی نہ ہونے کا، کبھی بھی معاشرہ میں اپنی جگہ بنانے کا، اس میں بے دفاع ہونے کا،

کھو جانے کا، اکیلے ہوجانے کا۔ جب اس پر دورے پڑتے ہیں تو وہ میرے اوپر حملہ کردیتی ہے، وہ مجھے کمرے میں بند کردیتی ہے، وہ گھونسے مار مار کر میری پٹائی کرتی ہے، وہ مجھے تھپڑ مارتی ہے، وہ میرے کپڑے اتار دیتی ہے، وہ میرے نزدیک آتی ہے، وہ میرے جسم کو سونگھتی ہے، میرے زیر جامہ کو، وہ کہتی ہے کہ اسے چینی آدمی کے عطر کی خوشبو آرہی ہے، وہ اس سے بھی آگے بڑھتی ہے، وہ دیکھتی ہے کہ کہیں زیر جامہ پر کوئی مشکوک دھبے تو نہیں، وہ چیختی ہے تاکہ پورا شہر سن لے، کہ اس کی بیٹی رنڈی ہے، کہ وہ اسے گھر سے نکال دے گی، کہ اس کی خواہش ہے کہ وہ مر جائے، کہ کوئی شخص بھی اس کے ساتھ کسی قسم کے تعلقات نہیں رکھے گا، کہ اس کی رسوائی ہوچکی ہے، کہ وہ ایک کتیا سے بھی بدتر ہے۔ اور وہ روتے روتے پوچھتی ہے کہ وہ اس کے ساتھ کیا کرے، ماسوا اس کے کہ وہ اسے گھر سے نکال دے تاکہ اِس جگہ کی بدبو ختم ہوجائے۔

بند کمرے کی دیواروں کے پیچھے، میرا بھائی۔

بھائی ماں کو جواب دیتا ہے، وہ اسے کہتا ہے کہ وہ بچی کو پیٹ کر ٹھیک کررہی ہے، اس کی آواز کھردری ہے، راز دارانہ ہے، ورغلانے والی ہے، وہ اسے کہتا ہے کہ انہیں سچائی کا علم ہونا چاہیئے، کسی بھی قیمت پر، بہت ضروری ہے کہ انہیں سچائی کا علم ہو تاکہ اس چھوٹی لڑکی کو بچایا جاسکے، تاکہ ماں کو ناامیدی سے بچایا جاسکے۔ ماں اپنی پوری طاقت سے پیٹتی ہے۔ چھوٹا بھائی

ماں کو چیختے ہوئے کہتا ہے کہ وہ لڑکی کو پیٹنا بند کرے۔ وہ باغیچہ میں چلا جاتا ہے، وہ چھپ جاتا ہے، اسے ڈر ہے کہ کہیں میں مر نہ جاؤں، اسے ڈر ہے، اسے ہمیشہ اِس اجنبی سے ڈر لگتا ہے، ہمارے بڑے بھائی سے۔ چھوٹے بھائی کا ڈر میری ماں کو دھیما کردیتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کی تباہی پر رو رہی ہے، اپنی رسوا شدہ بچی پر رو رہی ہے۔ میں بھی اس کے ساتھ رو رہی ہوں۔ میں جھوٹ بولتی ہوں۔ میں اپنی زندگی کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میرے ساتھ کچھ نہیں ہوا، ایک بوسہ تک نہیں۔تم یہ سوچ بھی کیسے سکتی ہو، میں کہتی ہوں، ایک چینی آدمی کے ساتھ، تم کیسے سوچ سکتی ہو کہ میں ایسا کام ایک چینی آدمی سے کروں گی، جو اتنا بدصورت ہے اور اتنا کمزور۔ میں جانتی ہوں کہ بڑا بھائی دروازے کے پیچھے جڑا ہوا ہے، وہ سن رہا ہے، وہ جانتا ہے کہ ماں میرے ساتھ کیا کررہی ہے، وہ جانتا ہے کہ چھوٹی برہنہ ہے، کہ اسے مار پڑ رہی ہے، وہ چاہتا ہے کہ مار یونہی پڑتی رہے، مزید پڑتی رہے، خطرے کی حد تک۔ میری ماں بڑے بھائی کے اس مبہم اور وحشت ناک ارادے سے لاعلم نہیں ہے۔

ہم ابھی بہت چھوٹے ہیں۔ میرے بھائیوں کی باقاعدگی کے ساتھ آپس میں جنگیں چھڑتی ہیں، کسی بھی ظاہری وجہ کے بغیر، بجز بڑے بھائی کی کلاسیکی وجہ سے، جو چھوٹے بھائی کو کہتا ہے: یہاں سے دفع ہوجاؤ، تم میرے راستے میں ہو۔ اور ساتھ ہی اسے مارنا شروع کردیتا ہے۔ وہ بغیر ایک لفظ بولے

آپس میں لڑ رہے ہیں، صرف ان کے سانسوں کی آوازیں آ رہی ہیں، ان کے کراہنے کی آوازیں، ان کے گھونسوں کی ٹھائیں ٹھائیں کی آوازیں۔ میری ماں، جیسے کہ ایسے تمام حالات میں ہوتا ہے، میری ماں کی چیخ و پکار اس منظر کا ساتھ دے رہی ہے۔

وہ دونوں غصے کی ایک ہی فطری صلاحیت کے حامل ہیں، اس قہر آلود قاتلانہ غصے کے، جوکہ ہمیشہ بھائیوں، بہنوں اور ماؤں کے علاوہ کہیں اورنہیں پایا جاتا۔ بڑا بھائی برداشت نہیں کرتا کہ اسے بدی کرنے کی کھلی چھٹی نہیں ہے، کہ اسے شر کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ صرف یہاں نہیں بلکہ دوسری تمام جگہوں پر بھی۔ چھوٹا بھائی یہ برداشت نہیں کرتا کہ اس دہشت کے سامنے وہ بے بس ہے، بڑے بھائی کے اس چال چلن کے سامنے۔

جب وہ آپس میں لڑتے تھے تو ہمیں ان دونوں کی موت کا ڈر ہوتا تھا۔ ماں کہتی تھی کہ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے رہتے تھے، کہ وہ کبھی بھی ایک دوسرے کے ساتھ نہیں کھیلے، کہ وہ کبھی بھی ایک دوسرے کے ساتھ باتیں نہیں کرتے تھے۔ کہ صرف ایک ہی چیز تھی جو ان دونوں میں مشترکہ تھی اور وہ ان کی ماں اور خصوصاً یہ چھوٹی لڑکی، خون کے علاوہ کچھ نہیں۔

میرا خیال ہے کہ صرف بڑے بچے کے بارے میں ہی ماں کہتی تھی: میرا بچہ۔ وہ کبھی کبھی اسے یوں پکارتی تھی۔ دوسرے دونوں کے لئے وہ کہتی تھی: چھوٹے۔

ان تمام چیزوں کے بارے میں باہر ہم کچھ نہیں کہتے تھے، ہم نے شروع شروع میں ہی سیکھ لیا تھا کہ ہم اپنی زندگی میں مروج اصول کے بارے میں خاموش رہیں: غربت۔ اور بعد میں باقی تمام چیزوں کے بارے میں بھی۔ ہمارے پہلے ہم راز، حالانکہ یہ لفظ غیر معقول لگتا ہے، ہمارے عاشق تھے، لوگ جنہیں ہم گھر سے باہر ملتے تھے، پہلے سائیگون کی گلیوں میں اور پھر بحری جہازوں میں، ریل گاڑیوں میں، اور پھر تمام دوسری جگہوں پر۔

میری ماں، اُسے یک دم یہ خیال آتا ہے، دوپہر کے آخری حصے میں، خاص طور پر خشک موسم میں، وہ گھر کو نیچے سے لیکر اوپر تک رگڑ رگڑ کر صاف کرواتی ہے، تاکہ اس کی پوری صفائی کی جائے، مانجھا جائے، اسے تازہ دم کیا جائے۔ گھر زمین کی ایک لمبی اور پتلی پٹی پر تعمیر کیا گیا ہے جو اسے باغیچہ سے علیحدہ کرتی ہے، سانپوں سے، بچھوؤں سے، سرخ چیونٹیوں سے، دریائے میکونگ کے سیلابوں سے، جو مون سون کے بڑے بڑے جھکڑوں کے بعد آتے ہیں۔ گھر کی زمین سے اس اونچائی کی وجہ سے اس کو پانی کی بالٹیوں سے دھویا جاسکتا ہے، ایک باغ کی طرح پانی دیا جاسکتا ہے۔ تمام کرسیوں کو میزوں کے اوپر رکھ دیا جاتا ہے، پورے گھر میں پانی ندی بن کر بہہ نکلتا ہے، چھوٹی بیٹھک میں پیانو کے پائیوں کے نیچے پانی ہی پانی ہے۔ سیڑھیوں سے پانی نیچے بہہ رہا ہے، اور صحن سے گزرتے ہوئے باورچی خانہ میں پھیل رہا

ہے۔ نوکر بچے بہت خوش ہیں، ہم بھی نوکر بچوں کے ساتھ ہیں، ہم ایک دوسرے پر پانی پھینک رہے ہیں، اور پھر ہم فرش کو مارسئی کے صابن کے ساتھ دھوتے ہیں۔ تمام لوگ ننگے پاؤں ہیں، ماں بھی۔ ماں ہنس رہی ہے۔ ماں کسی چیز کے خلاف کچھ بھی نہیں کہتی۔ پورا گھر ایک خوشبو سے بھرا ہوا ہے، طوفان کے بعد مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو، یہ ایسی خوشبو ہے جو خوشی سے پاگل کردیتی ہے خاص طور پر جب اسے دوسری خوشبو سے ملایا جاتا ہے، مارسئی کے صابن سے، پاکیزگی سے، تعظیم سے، صاف چادروں سے، اجلے پن سے، ہماری ماں کی خوشبو سے، ہماری ماں کی لامحدود صاف دلی سے۔ پانی گلیوں تک پہنچ جاتا ہے۔ نوکروں کے خاندان کے لوگ بھی آجاتے ہیں، نوکروں کے مہمان بھی، ہمسائے گھروں کے سفید فام لڑکے بھی۔ ماں اس شور وغل سے بہت خوش ہے، ماں کبھی کبھار بہت بہت خوش بھی ہوسکتی ہے، بھول جانے کے عرصہ تک، گھر کو دھونے کے وقت کا دورانیہ ماں کی خوشی کے لئے کافی ہوتا ہے۔ ماں بیٹھک میں جاتی ہے، وہ پیانو کے سامنے بیٹھ جاتی ہے، وہ کچھ وہی دھنیں بجاتی ہے جو اسے زبانی یاد ہیں، جو اس نے استانیوں کی تعلیم کے سکول میں سیکھی تھیں۔ وہ گاتی ہے۔ کبھی کبھی وہ پیانو بجاتی ہے، ہنستی ہے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور گاتے گاتے ناچنا شروع کردیتی ہے۔ اور سب یہی سوچتے ہیں، اور ماں بھی کہ اس بدہیئت بگڑی شکل کے گھر میں بھی انسان خوش ہوسکتا ہے، گھر جو یک دم ایک تالاب، دریا کے کنارے ایک کھیت، ایک

پایاب، ایک ساحل میں تبدیل ہوگیا ہے۔

یہ دو چھوٹے بچے ہیں، لڑکی اور چھوٹا بھائی، جو پہلے اس بارے میں یاد کرتے ہیں۔ وہ یک لخت ہنسنا بند کردیتے ہیں اور باہر باغیچہ میں چلے جاتے ہیں جہاں شام ڈھل رہی ہے۔

اس لمحے جب میں لکھ رہی ہوں، مجھے یاد آیا کہ ہمارا بڑا بھائی ون لونگ میں نہیں تھا جب ہم نے گھر کو پانی بہا کر دھویا تھا۔ وہ ہمارے سرپرست کے ساتھ رہ رہا تھا، گاؤں کا ایک پادری، فرانس کے علاقے لوتے گاروں میں۔

وہ بھی کبھی کبھار ہنستا تھا لیکن کبھی اتنا نہیں جتنا ہم۔ میں سب کچھ بھول جاتی ہوں، میں یہ کہنا بھول گئی کہ ہم ہنسیلے بچے تھے، میرا چھوٹا بھائی اور میں، اتنے ہنسیلے کہ ہنس ہنس کر ہمارا سانس ٹوٹ جاتا، ہماری زندگی کھو جاتی۔

مجھے جنگ انہی رنگوں میں دکھائی دیتی ہے جیسے کہ میرا بچپن۔ میں جنگ کا زمانہ اپنے بڑے بھائی کی حکومت کے زمانہ سے ملاتی ہوں۔ بلاشبہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جنگ کے زمانے میں ہی میرا چھوٹا بھائی فوت ہوا: اس کا دل، جیسے کہ میں نے پہلے کہا ہے، اُس نے جواب دے دیا، ہمت ہار دی۔ میرا خیال ہے کہ میں نے جنگ کے زمانہ میں بڑے بھائی کو کبھی نہیں دیکھا۔ کافی عرصہ پہلے ہی سے میرے لئے اس چیز کی کوئی اہمیت نہیں تھی کہ وہ زندہ تھا یا

فوت ہو چکا تھا۔ میں کبھی جنگ کو ایسے ہی دیکھتی ہوں جیسے اُس کو، ہر جگہ پھیلتے ہوئے، ہر جگہ گھستے ہوئے، چوری کرتے ہوئے، قید کرتے ہوئے، ہر جگہ موجود ہوتے ہوئے، ہر چیز کے ساتھ امتزاج کرتے ہوئے، مدغم ہوتے ہوئے، جسم میں موجود، خیالوں میں، جاگتے ہوئے، نیند میں، ہر وقت، بچے کے جسم کے دلکش علاقے پر مسلّط ہونے کے نشیلے جوش و جذبہ کا شکار، کمزور لوگوں کے جسموں کو، مغلوب لوگوں کو، کیونکہ بدی وہاں موجود ہے، دروازوں کے باہر، جلد کے ساتھ۔

ہم فلیٹ پر واپس جاتے ہیں۔ ہم عاشق ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرنا بند نہیں کرسکتے۔

کبھی کبھی میں بورڈنگ سکول واپس نہیں جاتی، میں اس کے پاس سوجاتی ہوں۔ میں اس کی بانہوں میں نہیں سونا چاہتی، اس کی گرماہٹ میں، لیکن میں اسی کمرے میں سوتی ہوں، اسی بستر میں۔ کبھی کبھی میں لیسے سے غیر حاضر ہوتی ہوں۔ ہم رات کو شہر میں کھانا کھانے کے لئے جاتے ہیں۔ وہ مجھے فوّارے سے نہلاتا ہے، وہ مجھے دھوتا ہے، وہ مجھے پانی سے کھنگالتا ہے، اسے یہ کرنا بہت پسند ہے، وہ میرا سنگھار کرتا ہے، وہ مجھے کپڑے پہناتا ہے، وہ میری پرستش کرتا ہے۔ میں اس کی زندگی کی پہلی ترجیح ہوں۔ اسے یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں میری کسی دوسرے آدمی سے آشنائی نہ ہوجائے۔ مجھے اس قسم کی

چیز کا کبھی بھی خدشہ نہیں ہوا۔ اسے ایک اور بھی خدشہ ہے، اس لئے نہیں کہ میں ایک گوری ہوں بلکہ اس لئے کہ میں اتنی نوعمر ہوں، اتنی کم سن کہ وہ جیل جاسکتا ہے اگر کسی کو ہمارے تعلقات کا پتہ چل گیا تو۔ وہ مجھے کہتا ہے کہ مجھے اپنی ماں سے جھوٹ بولتے رہنا چاہیئے اور خاص طور پر بڑے بھائی سے، کسی کو کچھ نہیں بتانا۔ میں جھوٹ بولتی رہتی ہوں۔ مجھے اس کے اس خدشہ پر ہنسی آتی ہے۔ میں اسے بتاتی ہوں کہ ہم اتنے غریب ہیں کہ میری ماں مقدمہ نہیں کرسکتی، اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ جتنے بھی مقدمات ماں نے دائر کئے وہ انہیں ہار گئی، مقدمے جو جائداد کے رجسٹرار کے خلاف تھے، حکومت کے افسروں کے خلاف، حکومت کے خلاف، قانون کے خلاف، اسے مقدمے چلانا نہیں آتا، وہ پُرسکون نہیں رہ سکتی، وہ انتظار نہیں کرسکتی۔ اور مزید انتظار، وہ یہ نہیں کرسکتی، وہ لڑتی ہے اور جیتنے کا امکان کھو دیتی ہے۔ اس مقدمہ کے ساتھ بھی یہی ہوگا، اس لئے اسے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ماری کلود کارپینٹر۔ وہ امریکی تھی، وہ، جہاں تک مجھے یاد ہے، بوسٹن سے تھی۔ اس کی آنکھیں ہلکی نیلی تھیں، سرمئی نیلی۔ 1943۔ ماری کلود کارپینٹر بلونڈ تھی۔ اس کی چمک دمک برقرار تھی۔ میرے خیال میں قدرے خوبصورت۔ اس کی مسکراہٹ کافی مختصر ہوتی تھی جو جلد ہی ختم ہوجاتی تھی، بجلی کی چمک کی طرح غائب ہوجاتی تھی۔ یکدم مجھے اس کی آواز یاد آجاتی ہے، نچلے سُر میں،

اونچے سُروں میں کچھ کرخت۔ اس کی عمر 45 سال تھی، پہلے ہی بوڑھی، بذاتِ خود بڑھاپا۔ وہ پیرس کے سولھویں ڈسٹرکٹ میں رہتی تھی، آلما سٹیشن کے پاس۔ اپارتماں ایک عمارت کی آخری اور کشادہ منزل پر مشتمل تھا، جو نیچے دریائے سین کا منظر پیش کرتی تھی۔ سردیوں میں ہم اس کے ہاں رات کے کھانے کے لئے جاتے۔ یا دوپہر کے کھانے کے لئے، گرمیوں میں۔ کھانے پیرس کے سب سے بہترین غذا کے فراہم کرنے والوں سے منگوائے جاتے۔ ہمیشہ قابل قبول، تقریباً تقریباً، لیکن بس کافی ہی، بخل کے ساتھ۔ ہم نے اسے ہمیشہ اس کے گھر میں ہی دیکھا، باہر کبھی نہیں۔ کبھی کبھار وہاں شاعر مالارمے پر ایک ماہر آدمی ہوتا۔ اور اکثر وہاں ایک یا دو یا تین ادبی شخصیات بھی ہوتیں، وہ ایک دفعہ آتے اور اس کے بعد دوبارہ وہاں دکھائی نہیں دیتے۔ مجھے کبھی پتہ نہیں چلا کہ وہ انہیں کہاں سے ڈھونڈھ کے لاتی تھی، اس کی ان سے کہاں سے واقفیت ہوئی یا وہ انہیں کیوں اپنے ہاں آنے کی دعوت دیتی۔ میں نے کبھی بھی ان میں سے کسی کے بارے میں کسی کو باتیں کرتا نہیں سنا اور نہ ہی ان کے ادبی کاموں کے بارے میں پڑھا ہے یا ان کے بارے میں سنا ہے۔ کھانا زیادہ وقت نہیں لیتا تھا۔ ہم جنگ کے بارے میں بہت باتیں کرتے، یہ سٹالن گراڈ کا زمانہ تھا، یہ 42 کی سردیوں کے آخری دنوں کی بات ہے۔ ماری کلود کارپینٹر بہت غور سے باتیں سنتی، وہ بہت سے سوالات کرتی، وہ بہت کم بولتی، اکثر کہتی کہ وہ حیران تھی کہ اتنے زیادہ واقعات کے بارے

میں اسے کتنا کم علم تھا، وہ ہنستی۔ کھانا کھانے کے فوراً بعد ہی وہ معذرت کرتی کہ اسے اتنی جلد وہاں سے جانا پڑ رہا ہے لیکن اسے کچھ کام کرنے تھے، وہ کہتی۔ اس نے کبھی نہیں بتایا کہ وہ کیا کام تھے۔ جب وہاں ہم کافی لوگ ہوتے تو ہم اس کی روانگی کے بعد ایک یا دو گھنٹے وہاں ٹھہر جاتے۔ وہ ہم سے کہتی: آپ لوگ اپنی مرضی کے ساتھ جتنا چاہیں ٹھہریں۔ اس کی غیر موجودگی میں کوئی بھی اس کے بارے میں بات نہیں کرتا۔ مزید میرا اپنا خیال ہے کہ کوئی شخص اس قابل ہی نہیں تھا کیونکہ کوئی بھی اسے نہیں جانتا تھا۔ ہم وہاں سے چل نکلتے، واپس گھر جاتے ہوئے ہمیں ہمیشہ یہ احساس ہوتا کہ ہم نے ایک قسم کا سفید ڈراؤنا خواب دیکھا تھا، اجنبیوں کے ساتھ کچھ گھنٹے گزار کر واپس آنے کا، کچھ مہمانوں کے ساتھ وقت گزارنے کا جن کی صورت حال بھی ہماری طرح تھی اور وہ بھی اجنبی، بغیر کسی مستقبل کے کچھ وقت گزارنے کا، کسی بھی محرک کے بغیر، انسانی یا کوئی دوسرا۔ یہ ایک تیسری سرحد پار کرنے کے مترادف تھا، جیسے ریل گاڑی میں سفر کرنا، جیسے کہ ڈاکٹروں کا انتظار کرنے والے کمروں میں وقت گزارنا، ہوٹلوں میں، ہوائی اڈوں میں۔ گرمیوں میں ہم دوپہر کا کھانا ایک بڑی بالکنی پر کھاتے جہاں سے دریائے سین کا منظر دکھائی دیتا تھا اور ہم کافی باغیچے میں پیتے تھے جو کہ عمارت کی پوری چھت پر پھیلا ہوا تھا۔ پیراکی اور نہانے کے لئے ایک تالاب بھی تھا۔ لیکن کوئی شخص اس میں داخل نہیں ہوتا تھا۔ ہم لوگ پیرس کو دیکھتے۔ خالی شاہراہیں، دریا، گلیاں۔ خالی

گلیوں کو، کٹلپا کے کِھلے ہوئے پھولوں کو۔ ماری کلود کارپینٹر۔ میں اس کی طرف بہت دیکھتی، تقریباً ہر وقت، وہ میرے دیکھنے سے پریشان ہوتی تھی لیکن میں اپنے آپ کو روک نہیں سکتی تھی۔ میں اس کی طرف دیکھتی تھی کہ مجھے پتہ چلے کہ وہ کون تھی، ماری کلود کارپینٹر۔ وہ یہاں کیوں تھی بنسبت کسی اور جگہ پر ہونے کے، اور یہ بھی کہ وہ اتنے دور دراز علاقے سے کیوں تھی، بوسٹن سے، وہ کیوں امیر تھی، ایسا کیوں تھا کہ کسی کو اس کے بارے میں قطعی علم نہیں تھا، کسی کو بھی، قطعی طور پر، کیوں یہ ظاہری جبری استقبالیئے، کیوں، کیوں اس کی آنکھوں میں، اندر بہت دُور، نظروں کی گہرائیوں میں، موت کا ایک ذرّہ، کیوں۔ ماری کلود کارپینٹر۔ کیوں اس کے تمام کپڑوں میں کوئی ناقابل بیان چیز تھی جس سے یوں لگتا تھا کہ کپڑے اس کے اپنے نہیں ہیں، کہ وہ کسی اور جسم پر ایسے ہی پہنے جاسکتے ہیں۔ کسی خاص رنگ کے بغیر، سادے سے، ہلکے رنگ کے، سفید، جیسے سردیوں کے بیچ میں موسم گرما۔

بیٹی فیرنانڈیز۔ مردوں کے بارے میں یادداشتیں اتنی روشن اور واضح نہیں ہوتیں جتنی کہ عورتوں کے بارے میں۔ بیٹی فیرنانڈیز۔ غیر ملکی، وہ بھی۔ جونہی اس کا نام لبوں پر آتا ہے، وہ سامنے آجاتی ہے، وہ پیرس کی ایک گلی میں پیدل چل رہی ہے، اس کی دور کی نظر خراب ہے، اسے بہت کم دکھائی دیتا ہے، ٹھیک طرح پہچاننے کے لئے اسے اپنی آنکھیں سکیڑنا پڑتی ہیں، وہ آپ

سے ہلکے سے ہاتھ ملاتی ہے۔ صبح بخیر، آپ ٹھیک ہیں نا؟ اب تو اسے فوت ہوئے عرصہ ہوچکا ہے۔ شاید تیس سال۔ مجھے اس کی خوبصورتی ابھی تک یاد ہے، اب تو بھولنے کے لئے بہت دیر ہوچکی ہے، ابھی تک کوئی چیز بھی اس کے کمال پر آنچ نہیں لاسکی، کوئی چیز کبھی بھی اس کے کمال پر آنچ نہیں لاسکتی، نہ وہ حالات، نہ وہ زمانہ، نہ سردی، نہ بھوک، نہ جرمنی کی شکست، نہ ہی اس جرم کا منظر عام پر آنا۔ وہ ان تمام چیزوں کی تاریخیت سے بالاتر ہوکر ہمیشہ گلی میں سے گزر رہی ہے، خواہ وہ کتنی ہی خوفناک نہ ہوں۔ یہاں بھی آنکھیں نیلی ہیں۔ گلابی رنگ کا لباس پرانا ہے، اور گلی میں سورج کی روشنی میں اس کا سیاہ چوڑے کناروں والا ہیٹ خاک آلود ہے۔ وہ نازک اندام ہے، بلند قامت، چینی سیاہی سے نقاشی کی ہوئی ہو، ایک نقش۔ لوگ چلتے چلتے رک جاتے ہیں اور حیرانگی سے اس اجنبی عورت کی خوش وضعی کی طرف دیکھتے ہیں جو بغیر کسی طرف دیکھے وہاں سے گزر رہی ہے۔ ملکہ کی طرح۔ فوراً پتہ نہیں چلتا کہ وہ کہاں سے ہے۔ اور پھر بندہ کہتا ہے کہ وہ کہیں باہر سے ہی یہاں آئی ہوگی، وہاں کہیں سے۔ وہ خوبصورت ہے، اس وجہ سے خوبصورت۔ اس نے پرانے یورپین کپڑے پہنے ہوئے ہیں، کمخواب کے بچے ہوئے ٹکڑے، غیر فیشنی پرانے سوٹ، پرانے پردوں کے بنے ہوئے، بچی کھچی چیزوں کے بنے ہوئے، پرانے ٹکڑے، فیشنی کپڑوں کے بچے پرانے ٹکڑے، کیڑوں کے کھائے ہوئے لومڑی کی کھال کے فر، پرانے لدھڑ کے سمور، اس کی خوبصورتی ایسے ہی

ہے، پارہ پارہ، رُوکھی رُوکھی، غم آلود، اور جلاوطنی کی، اس پر کوئی چیز زیب نہیں دیتی، اس کے لئے سب کچھ اس کے ناپ سے بڑا ہے، اور یہی اسے خوبصورت بناتا ہے، اُس کے کپڑے ڈھیلے ڈھالے ہیں، وہ بہت زیادہ دبلی پتلی ہے، اسے کوئی چیز بھی اس پر ٹھیک نہیں بیٹھتی، لیکن اس کے باوجود وہ بہت خوبصورت ہے۔ وہ بنی ہی ایسے ہے، اس کا چہرہ اور اس کا جسم، کہ جو کچھ اسے چھوتا ہے وہ فورا اس کی خوبصورتی کا حصہ بن جاتا ہے، قطعی طور پر۔

وہ مہمان نواز تھی، بَیٹی فیرنانڈیز، اس نے ایک خاص ''دن'' مخصوص کررکھا تھا۔ ہم کبھی کبھار وہاں جاتے تھے۔ وہاں، ایک دفعہ، دریولا روشیل بھی تھا، صاف ظاہر تھا کہ وہ تکبر کا شکار تھا، بہت کم گو تھا تاکہ اسے اِنکساری نہ کرنا پڑے، آواز لگتی تھی جیسے کہ ٹیپ پر چڑھائی ہوئی دوسری آواز ہو، ایسی زبان میں جیسے کہ وہ ترجمہ کی گئی ہو، ۔کرخت۔ شاید وہاں براسی لاک بھی ہو لیکن بدقسمتی سے اب مجھے یاد نہیں۔ سارتر وہاں کبھی نہیں آیا۔ وہاں موں پارناس کے شاعر بھی تھے لیکن اب مجھے کوئی نام یاد نہیں، ایک بھی نہیں۔ وہاں جرمن نہیں ہوتے تھے۔ ہم سیاست کے بارے میں باتیں نہیں کرتے تھے۔ ہم ادب کے بارے میں باتیں کرتے تھے۔ راموں فیرنانڈیز بالزاک کے بارے میں باتیں کرتا۔ ہم اس کی باتیں پوری رات سن سکتے تھے۔ وہ ایسے علم کے ساتھ باتیں کرتا جو کہ اب بھلایا جاچکا ہے اور جس کا اب کوئی ایسا حصہ باقی نہیں بچا جس کی پوری طرح تصدیق ہوسکے۔ وہ بہت کم معلومات دیتا، زیادہ

تر رائے۔ وہ بالزاک کے بارے میں ایسے باتیں کرتا جیسے کہ وہ اپنے بارے میں باتیں کررہا ہے، جیسے کہ ایک دفعہ اس نے بھی وہی بننے کی کوشش کی ہو، بالزاک۔ راموں فیرناندیز کے ہاں ایک بے مثال خوش خلقی تھی، علم میں بھی، ایک ایسا طریقہ جو بیک وقت گہرا بھی تھا اور شفاف بھی، علم کو ایسے استعمال کرنا کہ وہ دوسروں کو کبھی بھی نہ تو مجبوری کا احساس دے اور نہ ہی بوجھل لگے۔ وہ ایک بہت مخلص آدمی تھا۔ اس سے گلی میں، قہوہ خانہ میں، مل کر ہمیشہ بہت خوشی ہوتی تھی، اُسے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی، اور یہ سچ تھا، وہ ہمیشہ خوشی سے آداب کرتا تھا۔ صبح بخیر، آپ ٹھیک ہیں نا؟ اور یہ، انگریزی طریقہ سے، بغیر وقفہ دیئے، ہنستے ہنستے، اور اس ہنسی کے دوران یہ مذاق خود ایک جنگ بن جاتا اور ساتھ ساتھ وہ ناگزیر تکلیفیں جو اس سے نکلتی ہیں، گوریلا مزاحمت اور معاونت پسندی، بھوک اور سردی، جاں نثاری اور بدنامی۔ وہ، بَیٹی فیرناندیز، صرف لوگوں کے بارے میں باتیں کرتی، جنہیں اس نے سڑکوں گلیوں میں دیکھا تھا، یا جنہیں وہ جانتی تھی، کہ ان کا کیا حال تھا، وہ چیزیں جو دکانوں کے شیشے لگے الماریوں میں ابھی بکی نہیں تھیں، دودھ کا ضمنی راشن، مچھلی کا، اشیا کی کمی کے ساتھ نمٹنے کا اچھا حل، سردی کا، مستقل بھوک کا، وہ زندگی کی عملی تفصیلات میں بہت دلچسپی لیتی تھی، وہ اس سے باہر نہیں نکلتی تھی، وہ ہمیشہ ایک اچھی دوست تھی، بہت وفادار، اور بہت مشفق تھی۔ وہ وطن دشمن سرگرمیوں میں شریک کار تھے، دونوں فیرناندیز۔ اور میں جنگ کے دو سالوں

کے بعد، فرانسیسی کمیونسٹ پارٹی کی رکن۔ یہ مشابہت قطعی اور حتمی ہے۔ یہ دونوں چیزیں ایک ہی ہیں، وہی دردمندی، ہمدردی، مدد کے لئے وہی پکار، وہی قوتِ فیصلہ کی خامی، اسے وہی توہم پرستی کہہ لیں جس کے مطابق ذاتی مسئلوں کا سیاسی حل ممکن ہے۔ وہ بھی، بَیٹی فیرنانڈیز، وہ بھی جرمنی کے قبضہ کئے ہوئے زمانے کی خالی گلیوں کو دیکھتی تھی، وہ پیرس کو دیکھتی تھی، کیٹلپا کے درختوں پر لگے ہوئے پھولوں والے چوراہوں کو دیکھتی، دوسری عورت کی طرح، ماری کلود کارپینٹر کی طرح۔ ویسے ہی اس کے ہاں بھی استقبالیہ کے لئے خاص دن مقرر تھے۔

وہ اسے کالی لیموزین میں واپس بورڈنگ سکول چھوڑتا ہے۔ وہ دروازے سے کچھ فاصلہ پر رک جاتا ہے تاکہ کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ اب رات ہوچکی ہے۔ وہ کار سے اترتی ہے، وہ بھاگ کر اندر جاتی ہے، وہ اسے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتی۔ بڑے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی وہ دیکھتی ہے کہ کھیل والے بڑے میدان میں ابھی تک روشنی جل رہی ہے۔ جونہی وہ غلام گردش سے نکلتی ہے، وہ اسے دکھائی دیتی ہے، وہ لڑکی جو اس کا انتظار کررہی ہے، جو پہلے ہی سے پریشان ہے، کھڑی ہے، بغیر کسی مسکراہٹ کے۔ وہ اُس سے پوچھتی ہے: تم کہاں تھیں؟ وہ کہتی ہے، میں سونے کے لئے یہاں واپس نہیں آئی۔ وہ یہ نہیں بتاتی کہ کیوں اور ایلین لاگونیل اس سے پوچھتی بھی نہیں۔ وہ

اپنا ہیٹ اتارتی ہے اور رات کے لئے اپنی چوٹیوں کو کھولتی ہے۔ تم لیسے بھی نہیں گئیں۔ وہاں بھی نہیں۔ ایلین بتاتی ہے کہ انہوں نے فون کیا تھا، یہی وجہ ہے کہ اسے یہ پتہ چلا، کہ اسے پرنسپل کے دفتر جانا پڑے گا۔ باہر میدان کے سائے میں بہت سی لڑکیاں موجود ہیں۔ ان تمام لڑکیوں نے سفید کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے درختوں پر لیمپ لگے ہوئے ہیں۔ کچھ کمروں میں ابھی تک روشنی ہے۔ کچھ طالب علم ابھی تک پڑھ رہے ہیں، دوسرے کمرۂ جماعت میں بیٹھے گپیں لگا رہے ہیں، یا تاش کھیل رہے ہیں، یا گا رہے ہیں۔ ان کے سونے کے لئے کوئی خاص وقت مقرر نہیں ہے، دن کے وقت اتنی گرمی ہوتی ہے کہ انہیں شام کو اپنی مرضی سے ادھر ادھر گھومنے کی اجازت ہے، اگر نوجوان استانیاں انہیں اجازت دیں تو۔ حکومت کے بورڈنگ سکول میں صرف ہم دو سفید فام لڑکیاں ہیں۔ یہاں بہت سی مخلوط النسل لڑکیاں ہیں، جن میں سے زیادہ تر ایسی ہیں جنہیں ان کے والد نے چھوڑا ہوا ہے، فوجی یا ملاح یا کوئی چھوٹا موٹا افسر جو کہ محصول چنگیوں، ڈاک خانہ، یا تعمیرات عامہ کے لئے کام کرتا ہے۔ زیادہ تر لڑکیوں کی پرورش حکومت کے فلاحی ادارے کرتے ہیں۔ یہاں پر کچھ چار نسلی مخلوط النسل لڑکیاں بھی ہیں۔ ایلین لاگونیل کو یقین ہے کہ فرانسیسی حکومت ان کو پالتی ہے تا کہ وہ ہسپتالوں میں نرسیں بنیں یا یتیم خانوں میں کام کریں، کوڑھ کے مریضوں کی کالونی میں، پاگل خانوں میں۔ ایلین لاگونیل کا خیال ہے کہ انہیں ہیضہ اور طاعون کے مریضوں کے خاص

علیحدہ ہسپتالوں میں بھی بھیجا جاتا ہے۔ یہ ہے جو کہ ایلین لاگونیل کا خیال ہے اور وہ روتی ہے کیونکہ وہ اس قسم کی کوئی بھی ملازمت نہیں کرنا چاہتی، وہ ہمیشہ بورڈنگ سکول سے بھاگنے کی بات کرتی ہے۔

میں ڈیوٹی پر موجود استانی کو ملنے جاتی ہوں، وہ بھی ایک مخلوط النسل نوجوان عورت ہے جو میری اور ایلین لاگونیل کی طرف بہت دیکھتی رہتی ہے۔ وہ کہتی ہے: آپ لیسے نہیں گئیں اور آپ کل رات یہاں سوئی بھی نہیں، ہمیں آپ کی امی کو اطلاع دینی پڑے گی۔ میں اس سے کہتی ہوں کہ میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا لیکن آج کے بعد میں کوشش کروں گی کہ بورڈنگ سکول آ کر سوؤں، نیز یہ کہ میری ماں کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ نوجوان استانی میری طرف دیکھتی ہے اور مسکراتی ہے۔

میں وہی کام دوبارہ کروں گی۔ میری ماں کو اطلاع دی جائے گی، وہ بورڈنگ سکول کی سربراہ کو ملنے آئے گی اور وہ اس سے کہے گی کہ شام کو مجھے کھلی چھٹی دے دی جائے، میرے واپس آنے کے اوقات پر نظر نہ رکھی جائے، مجھے بورڈنگ سکول کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ اتوار کی چہل پہل کے لئے مجبور نہ کیا جائے۔ وہ کہتی ہے: یہ ایسی بچی ہے جو ہمیشہ آزاد رہی ہے، اگر اُسے یہ آزادی نہیں ملتی تو وہ یہاں سے فوراً بھاگ جائے گی، میں جو کہ اس کی ماں ہوں، میں بھی اس کے خلاف کچھ نہیں کرسکتی، اگر میں نے اسے اپنے پاس رکھنا ہے تو مجھے اس کو آزادی دینی پڑے گی۔ سربراہ مان جاتی ہے

کیونکہ میں گوری ہوں اور بورڈنگ سکول کی ساکھ کے لئے بہت ضروری ہے کہ مخلوط النسل لڑکیوں کے ساتھ ساتھ کچھ گوری لڑکیاں بھی ہوں۔ میری ماں نے یہ بھی کہا کہ میں آزاد ہوتے ہوئے بھی لیسے میں بہت محنت سے پڑھائی کرتی ہوں اور کہ جو کچھ اس کے ساتھ بیٹوں کی نسبت ہوا وہ بہت بُرا تھا، سنگین تھا اور اب چھوٹی کی تعلیم ہی تھی جو اس کی فقط امید تھی۔

سربراہ نے مجھے بورڈنگ سکول میں ایسے رہنے دیا جیسے کہ میں ایک ہوٹل میں رہ رہی ہوں۔ جلد ہی میری منگنی والی انگلی میں ایک ہیرا ہوگا۔ پھر بورڈنگ سکول کی استانیاں تبصرے کرنا بند کردیں گی۔ انہیں یقیناً شک ہوگا کہ میری منگنی نہیں ہوئی، لیکن ہیرا بہت قیمتی ہے، کسی کو بھی شک نہیں ہوگا کہ یہ اصلی نہیں ہے اور پھر کوئی بھی ایسی بات نہیں کرے گا کیونکہ چھوٹی لڑکی کو دیئے گئے اس ہیرے کی قیمت بہت زیادہ ہے۔

میں ایلین لاگونیل کی طرف واپس آتی ہوں۔ وہ ایک بنچ پر لیٹی ہے اور رو رہی ہے کیونکہ وہ سمجھتی ہے کہ میں بورڈنگ سکول چھوڑنے والی ہوں۔ میں بینچ پر بیٹھ جاتی ہوں۔ میں ، اپنے ساتھ لیٹی ہوئی ایلین لاگونیل کے جسم کی خوبصورتی سے عاجز ہوں۔ یہ جسم لاثانی ہے۔ لباس کے نیچے برہنہ، اور ہاتھوں کی رسائی تک موجود۔ اُس کی چھاتیاں ایسی ہیں کہ اُس جیسی میں نے کبھی نہیں دیکھیں۔ میں نے اُنہیں کبھی نہیں چُھوا۔ وہ بے حیا ہے، ایلین لاگونیل،

اُس کو کوئی اندازہ نہیں ہے، وہ اجتماعی خواب گاہ میں بالکل برہنہ پھرتی رہتی ہے۔ خدا کی طرف سے عطا کی ہوئی تمام چیزوں میں جو چیز سب سے خوبصورت ہے، وہ یہی ہے ایلین لاگونیل کا جسم، بے مثال، متوازن خدوخال اور اس طرح سے جیسے اُس کے جسم نے اُس کی چھاتیوں کو اُٹھایا ہوا ہے، جیسے کہ وہ مختلف اشیاء ہوں۔ کوئی چیز بھی اتنی حیرت انگیز نہیں ہے۔ جتنی ان چھاتیوں کی بیرونی گولائی، یہ باہر کو نکلے ہوئے حصے جو کہ ہاتھوں کی نذر کیے جارہے ہیں۔ اِس تابنا کی کے سامنے میرے چھوٹے بھائی کا ایک گُلی جیسا جسم بھی غائب ہوجاتا ہے۔ آدمیوں کے جسموں کی شکل بخیل ہوتی ہے۔ اُن کے جسم، ایلین لاگونیل کے جسم کی طرح جلد خراب بھی نہیں ہوتے، جو کہ، کبھی بھی زیادہ دیر ٹھہرتے نہیں، گِن گِنا کے شاید ایک موسمِ گرما، بس۔ ایلین لاگونیل دلات کے سطحِ مرتفع سے آئی ہے۔ اُس کا باپ ڈاکخانے میں ملازمت کرتا ہے۔ ایلین لاگونیل تھوڑا عرصہ پہلے ہی سکول کے تعلیمی سال کے بیچ میں سکول میں داخل ہوئی تھی۔ وہ ڈرتی ہے، وہ آپکے ساتھ آکر بیٹھ جاتی ہے، اور وہیں خاموش بیٹھی رہتی ہے، اور اکثر روتی رہتی ہے ۔ اُسکی جلد کا رنگ پہاڑوں سے آئے ہوئے لوگوں کی طرح گلابی اور بادامی ہے، وہ یہاں ہمیشہ آسانی سے پہچانی جاسکتی ہے۔ کیونکہ یہاں تمام بچوں کا رنگ کمِی خون اور دھوپ کی شدت کی وجہ سے ہلکے ہرے رنگ کا ہوتا ہے۔ ایلین لاگونیل فرانسیسی لِیسے نہیں جاتی۔ وہ سکول جانے کے قابل نہیں ہے، ایلین ل۔ وہ

پڑھتی نہیں، اُسے کچھ یاد نہیں رہتا۔ وہ بورڈنگ سکول میں شروع کی جماعتوں میں پڑھتی ہے لیکن اسکا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ میرے جسم سے چمٹی روتی رہتی ہے۔ اور میں اُس کے بالوں کو سہلاتی ہوں، اُس کے ہاتھوں کو، میں اُسے کہتی ہوں کہ میں بورڈنگ سکول میں اُس کے ساتھ رہوں گی۔ وہ نہیں جانتی کہ وہ بہت خوبصورت ہے، ایلین ل۔ اُس کے ماں باپ کو سمجھ نہیں آتی کہ وہ اُسکے ساتھ کیا کریں۔ وہ جلدازجلد اسکی شادی کروانا چاہتے ہیں۔ اُسے، ایلین لاگونیل کو، اُسکی چاہت کے مطابق کوئی بھی منگیتر مل سکتا ہے، لیکن وہ کسی کو نہیں چاہتی، وہ شادی نہیں کرنا چاہتی، وہ اپنی ماں کے پاس واپس جانا چاہتی ہے وہ۔ ایلین ل۔ ایلین لاگونیل۔ وہ بالآخر وہی کرے گی جو اُسکی ماں چاہے گی۔ وہ مجھ سے بہت خوبصورت ہے، سرکس کے جوکروں والا ہیٹ پہنے، طلّے والے جوتے پہنے، وہ اِس سے کہیں زیادہ شادی کے قابل ہے، ایلین لاگونیل، اُسے، اُسکی شادی کروائی جاسکتی ہے، اُسکا گھر بسایا جاسکتا ہے، اُسے ڈرایا جاسکتا ہے، اُسے سمجھایا جاسکتا ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو اُسے خوف دلاتی ہے۔ اور جسے وہ نہیں سمجھ پاتی، اُسے حکم دیا جاسکتا ہے کہ وہ وہاں ہی رہے، اور انتظار کرے۔

ایلین لاگونیل، وہ، وہ ابھی تک وہ کچھ نہیں جانتی جو میں جانتی ہوں۔ وہ، حالانکہ وہ سترہ برس کی ہے۔ یہ تو یوں ہے جیسے کہ مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ کبھی بھی وہ کچھ نہیں جان پائے گی جسکا مجھے علم ہے۔

ایلین لاگونیل کا جسم بھاری ہے، ابھی تک معصوم ہے، اس کی جلد کی نرمی ایسے ہے جیسے کچھ پھلوں کی ہوتی ہے، وہ ایسے ہے کہ اسے بمشکل گرفت میں لیا جاسکتا ہے، وہ کچھ کچھ خیالی ہے، یہ بہت زیادتی ہے۔ ایلین لاگونیل خواہش پیدا کرتی ہے کہ اسے قتل کردیا جائے، وہ ایک ایسا حسین خواب پیدا کرتی ہے کہ اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کردیا جائے۔ اس کی آٹے جیسی وہ سفید چیزیں ایسے ہیں جیسے کہ اُس نے انہیں اَن جانے طور پر اٹھایا ہوا ہے۔ کیا ہوا ہے، وہ ان چیزوں کو ایسے پیش کرتی ہے کہ ہاتھوں کے ساتھ انہیں گوندھا جائے، کہ انہیں منہ سے کھایا جائے، وہ انہیں قابو میں نہیں رکھتی، اسے ان کا کوئی علم نہیں، اُسے ان کی حیرت انگیز طاقت کا بھی علم نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ میں ایلین لاگونیل کی چھاتیوں کو ایسے کھاؤں جیسے کہ وہ آدمی چینی شہر کے ایک کمرے میں میری چھاتیوں کو کھاتا ہے، جہاں میں ہر شام کو خدا کے بارے میں اپنے علم میں اضافہ کرنے جاتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کی ان سفید باریک پسے ہوئے آٹے جیسی چھاتیوں میں ہڑپ ہوجاؤں۔

میں ایلین لاگونیل کی خواہش سے عاجز آ گئی ہوں۔

میں خواہش سے عاجز آ گئی ہوں۔

میں ایلین لاگونیل کو اپنے ساتھ اس جگہ لے جانا چاہتی ہوں جہاں ہر

شام، آنکھیں بند کئے ہوئے، میں اپنے آپ کو ایسی لذت دلواتی ہوں جس سے میری چیخیں نکل جاتی ہیں۔ میں ایلین لاگونیل کو اس آدمی کے حوالے کرنا چاہتی ہوں جو میرے ساتھ وہ کچھ کرتا ہے تاکہ وہ اُس کے ساتھ بھی وہی کرے۔ اور وہ بھی میری موجودگی میں، کہ ایلین لاگونیل وہی کرے جس کی مجھے خواہش ہو، کہ وہ اس جگہ اپنے آپ کو اس کے حوالے کرے جہاں میں وہ کرتی ہوں۔ ایلین لاگونیل کے جسم کے ذریعہ، اس کے جسم سے پار ہوتے ہوئے اس آدمی سے آتے ہوئے لذت میرے تک پہنچے گی، اور یہ حتمی ہوگی۔
موت کی حد تک لے جانے والی لذت۔

میری نظروں میں ایلین لاگونیل اسی گوشت کی بنی ہوئی ہے جس کا چولون کا وہ آدمی لیکن ایلین لاگونیل ایک چمکتے، شمسی، معصوم، زمانہ حال میں، اپنے آپ بار بار کھِلنے والی، ہر حرکت، ہر ادا، ہر آنسو، ہر خامی، ہر بے علمی میں۔ ایلین لاگونیل اس ضامن آدمی کی ہم صحبت ہے جو مجھے اتنی دقیق لذت دیتا ہے، اتنی سخت ناقابل برداشت لذت، چولون کا یہ گمنام آدمی، چین کا آدمی۔ ایلین لاگونیل چین سے ہے۔

میں ایلین لاگونیل کو نہیں بھولی۔ میں اس ضامن آدمی کو نہیں بھولی۔ جب میں وہاں سے چلی گئی، جب میں نے اسے چھوڑ دیا، میں دو سال تک کسی دوسرے آدمی کے نزدیک بھی نہیں گئی۔ لیکن یہ پُراسرار وفاداری میں نے

اپنے ساتھ ہی کی ہوگی۔

میں ابھی تک اس خدان کے ساتھ ہوں، میں وہاں ہی رہتی ہوں بجائے کسی بھی اور جگہ رہنے کے۔ اس خاندان کا بنجر پن، اس کی سخت مزاجی، اس کی عداوت، یہی چیزیں ہیں جہاں میں اپنے آپ کو پوری طرح محفوظ سمجھتی ہوں، اپنے اس بنیادی یقین میں، کہ بعد میں میں لکھا کروں گی۔

یہی وہ جگہ ہے جہاں بعد میں، جب زمانۂ حال کو چھوڑوں گی، مجھے کسی بھی دوسری جگہ کی بجائے رہنا ہے۔ جو گھنٹے میں چولون کے فلیٹ میں گذارتی ہوں، ان کی وجہ سے یہ جگہ ایک تازہ، نئی روشنی میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ ایک ناقابل برداشت جگہ ہے، یہ موت کے ساتھ ملی ہوئی ہے، تشدد کی جگہ، دُکھ کی، مایوسی کی، بے عزتی کی۔ اور چولون بھی ایسی ہی جگہ ہے۔ دریا کے دوسری طرف، دریا کو پار کر کے۔

مجھے علم نہیں کہ ایلن لاگونیل کا کیا بنا، آیا وہ مرچکی ہے۔ وہی تھی جو بورڈنگ سکول سے پہلے چلی گئی، میرے فرانس جانے سے بہت پہلے۔ وہ واپس دالات چلی گئی تھی۔ اس کی ماں تھی جس نے اسے واپس دالات آنے کے لئے کہا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اسے شادی کے لئے واپس بلایا گیا تھا، کیونکہ اسے فرانس سے حال ہی میں واپس آئے ہوئے ایک آدمی سے

ملوانا تھا۔ شاید مجھے غلطی لگ رہی ہو، اور میں وہ کچھ گڈمڈ کررہی ہوں جو کہ میرے ذہن میں تھا کہ ایلین لاگونیل کے ساتھ ہونے والا تھا، کیونکہ اس کی ماں نے اسے فوری طور پر واپس بلالیا تھا۔

میں آپ کو یہ بھی بتاتی چلوں کہ اس شخص نے کیا کیا، اور کیا حالات تھے۔ بات یہ ہے: وہ نوکروں کی چوری کرتا ہے تاکہ جاکر افیون پیئے۔ وہ ہماری ماں کی چوری کرتا ہے۔ وہ الماریوں کی تلاشی لیتا ہے۔ وہ چوری کرتا ہے۔ وہ جُوا کھیلتا ہے۔ میرے باپ نے اپنی موت سے پہلے لانتردومیر کے علاقے میں ایک گھر خریدا تھا۔ یہ ہماری واحد جائداد تھی۔ وہ جوا کھیلتا ہے۔ میری ماں اس کے قرضے چکانے کے لئے گھر کو بیچ دیتی ہے۔ لیکن یہ کافی نہیں ہے، یہ کبھی بھی کافی نہیں ہے۔ جب وہ چھوٹا تھا تو اس نے مجھے کوپول کے گاہکوں کو بیچنے کی کوشش کی۔ اور یہ وہ ہے جس کے لئے میری ماں مزید زندہ رہنا چاہتی ہے، تاکہ اس کو کھانے کے لئے ملتا رہے، تاکہ وہ گرم کمرے میں سوسکے، تاکہ اس کو اپنا نام پکارتے ہوئے سنائی دے۔ اور جو جائداد ماں نے آمبوآز کے علاقے میں اسے خرید کردی، دس سال کی بچت۔ ایک ہی رات میں گروی۔ وہ سود ادا کررہی ہے۔ اور اس جنگل کے درختوں کو کاٹ کر آنے والی آمدنی، جس کے متعلق میں نے آپ کو بتایا ہے۔ ایک ہی رات میں۔ اس نے ماں کو مرتے مرتے بھی لوٹا۔ یہ ایسا شخص تھا جو الماریوں کی

تلاشی لیتا تھا، جس کے پاس ایک خاص صلاحیت تھی، جسے اچھی طرح تلاشی لینا آتا تھا، چادروں کے ڈھیر میں بھی ڈھونڈنے کا، چھپائی ہوئی جگہوں میں بھی۔ اس نے شادی کی انگوٹھیاں چوری کیں، اس قسم کی چیزیں، بہت زیادہ، جواہرات، کھانا۔ اس نے دو کی بھی چوری کی، نوکروں کی، میرے چھوٹے بھائی کی۔ میری، بہت زیادہ۔ وہ تو اسے بھی بیچ دیتا، میری ماں کو۔ جب وہ فوت ہوتی ہے تو وہ فوراً وکیل کو بلواتا ہے، موت کے صدمے کے دوران ہی، وہ جانتا ہے کہ موت کے صدمے سے وہ کیسے فائدہ اٹھائے۔ وکیل کہتا ہے کہ وصیت نامہ آئینی نہیں ہے۔ کہ اس میں میرے نقصان کے برعکس بیٹے کو بہت زیادہ فوقیت دی ہے۔ غیر یکسانیت بہت زیادہ ہے، مضحکہ خیز۔ ضروری ہے کہ میں تمام حقیقت کو جانتے ہوئے یا تو منظور کروں یا رد کروں۔ میں کہتی ہوں کہ مجھے منظور ہے: میں دستخط کردیتی ہوں۔ میں نے منظور کرلیا۔ میرا بھائی، آنکھیں جھکی ہوئی، شکریہ۔ وہ رو رہا ہے۔ ہماری ماں کی موت کے صدمے میں۔ وہ مخلص ہے، جب پیرس آزاد ہوا تو اسے بھاگنا پڑا شاید اس وجہ سے کہ وہ جنوبی فرانس میں معاونت پسند تھا، اور اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کہاں جائے۔ وہ میرے ہاں آتا ہے۔ مجھے کبھی پتہ نہیں چلا کہ وہ کس خطرہ سے بھاگ رہا ہے۔ شاید اس نے لوگوں کے بارے میں مخبری کی ہو، یہودیوں کے بارے میں، سب کچھ ممکن ہے۔ وہ بہت نرم دل ہے، ہمیشہ کی طرح مشفق، قتل کرنے کے بعد یا جب اسے آپ سے کوئی ضرورت پوری کرنی ہوتی

ہے۔ میرے خاوند کو جلاوطن کردیا گیا ہے۔ وہ مجھ سے ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ وہ تین دن میرے ہاں رہتا ہے۔ میں بھول چکی ہوں، جب میں باہر جاتی ہوں تو میں کسی چیز کو تالا نہیں لگاتی۔ وہ تلاشی لیتا ہے۔ میں نے راشن سے لی ہوئی چینی اور چاولوں کو اپنے خاوند کی واپسی تک کے لئے سنبھال کے رکھا ہوا ہے۔ وہ تلاشی لیتا ہے اور اپنے پاس رکھ لیتا ہے۔ وہ میرے کمرے میں ایک چھوٹی الماری کی تلاشی لیتا ہے۔ وہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ وہ میری تمام کی تمام جمع کی ہوئی بچت لے لیتا ہے، پچاس ہزار فرانک۔ وہ ایک چھوٹا سا رقعہ بھی نہیں چھوڑتا۔ وہ چوری کی ہوئی چیزوں کے ساتھ فلیٹ سے چلا جاتا ہے۔ جب میری اس سے دوبارہ ملاقات ہوگی تو میں اس بارے میں ذکر نہیں کروں گی، اس کے لئے یہ بہت شرمناک ہوگی، میں یہ نہیں کرسکوں گی۔ جعلی وصیت نامہ کے بعد لوئی چہاردہم کا جعلی قلعہ نما محل کوڑیوں کے مول پر بیچا جاتا ہے۔ یہ فروخت بھی گھڑا ہوا منصوبہ تھا، وصیت نامہ کی طرح۔

میری ماں کی موت کے بعد وہ اکیلا ہے۔ اس کے کوئی دوست نہیں ہیں، اس کے کبھی بھی دوست نہیں تھے، اس کے پاس کبھی کبھار کچھ عورتیں آتی تھیں جن سے وہ موں پارناس میں ''کام'' کرواتا تھا، کبھی کبھار کچھ ایسی عورتیں بھی جن سے وہ کام نہیں کرواتا تھا، کم از کم شروع میں، کبھی کبھار کچھ آدمی بھی، لیکن وہ اسے پیسے دیتے تھے۔ اس نے اپنی زندگی اکیلے پن میں گزاری۔ یہ تنہائی اس کی عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ وہ صرف ایک غنڈا تھا، وہ چھوٹے

پیمانے پر ہی کام کرتا تھا۔ وہ صرف اپنے ارد گرد ہی خوف پھیلا سکتا تھا، اس سے باہر نہیں۔ ہمارے ساتھ اس نے اپنے کلی اقتدار کو کھودیا۔ وہ ایک داداگیر نہیں تھا، وہ صرف خاندانی بدمعاش تھا، الماریوں کی تلاشی لینے والا، بغیر ہتھیار کے قتل کرنے والا۔ وہ خطرہ مول نہیں لیتا تھا۔ غنڈے ایسی ہی زندگی بسر کرتے ہیں جیسی کہ وہ کررہا تھا، بغیر وفاداری کے، بغیر رعب داب کے، خوف کے ساتھ۔ وہ خوفزدہ تھا۔ میری ماں کی وفات کے بعد وہ ایک عجیب سی زندگی بسر کرتا ہے۔ تور کے شہر میں۔ وہ صرف قہوہ خانوں کے ملازموں کو ہی جانتا ہے گھڑ دوڑ کے بارے میں ''مفید اشاروں'' کے لئے، اور شرابی گاہکوں کو جو پچھلے کمروں میں بیٹھے تاش کھیلتے ہیں۔ اس کی شکل ان کی طرح ہوگئی ہے، وہ بہت پیتا ہے، اس کی آنکھیں سرخ ہیں، اور اس کے بولنے کا انداز بھی غیر واضح ہے۔ تور میں اس کے پاس کچھ نہیں۔ دونوں گھروں کو بیچنے کے بعد، کچھ نہیں۔ ایک سال تک وہ ایک گودام میں رہتا رہا جسے میری ماں نے کرائے پر لیا ہوا تھا۔ ایک سال تک وہ ایک آرام دہ کرسی میں سوتا رہا۔ انہوں نے اسے وہاں جانے دیا۔ ایک سال تک۔ اور پھر اسے باہر نکال دیا گیا۔

ایک سال کے عرصے تک اسے یقیناً امید تھی کہ وہ اپنے گروی کی ہوئی جائداد واپس خرید لے گا۔ ایک ایک کرکے اس نے میری ماں کے گودام میں پڑے ہوئے فرنیچر کو جوئے میں ہارنا شروع کردیا، کانسی کے بنے ہوئے بدھا کے مجسّمے، پیتل، اور پھر بستر، اور پھر الماریاں، اور پھر چادریں۔ اور پھر ایک

دن اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہا، اس جیسے لوگوں کے ساتھ ایسے ہی ہوتا ہے، ایک دن اس کے پاس صرف پہنا ہوا سوٹ ہی تھا، اس کے علاوہ کچھ نہیں، ایک چادر بھی نہیں، کھانے پینے کے برتن بھی نہیں۔ وہ اکیلا ہے۔ ایک سال تک کسی نے بھی اس کے لئے دروازہ نہیں کھولا۔ اس نے پیرس میں رہنے والے چچازاد کو خط لکھا۔ اسے مالذیرب کے علاقے میں واقع نوکروں کا ایک کمرہ مل جاتا ہے۔ اور جب اس کی عمر پچاس سال سے تجاوز کرتی ہے تو اس کو زندگی کا پہلا کام ملے گا، زندگی کی پہلی تنخواہ، وہ ایک بحری بیمہ کمپنی میں ہرکارہ کے طور پر کام کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ کام پندرہ سال تک جاری رہا۔ پھر اسے ہسپتال جانا پڑا۔ وہ فوت وہاں نہیں ہوا۔ وہ اپنے کمرے میں ہی فوت ہوا۔

میری ماں نے اس بچے کے بارے میں کبھی بات نہیں کی۔ اس نے کبھی شکایت نہیں کی۔ اس نے کبھی بھی کسی کے ساتھ بھی اُس الماریوں کی تلاشی لینے والے کے بارے میں بات نہیں کی۔ اس نے اس کی ماں ہونے کو ایسے لیا کہ جیسے یہ کوئی جرم ہو۔ اس نے اس کو چھپائے رکھا۔ اس کا خیال ہوگا کہ جو کوئی بھی اس کے بیٹے کو نہیں جانتا تھا جیسے کہ وہ اُسے جانتی تھی، خدا کے سامنے اور صرف اس کے سامنے، ان کے لئے اُسے بیان کرنا ناقابل فہم، ناقابل بیان تھا۔ وہ اس کے بارے میں فرسودہ جملے کہتی، ہمیشہ ایک ہی قسم

کے۔ کہ اگر وہ چاہتا تو تینوں میں سب سے زیادہ ذہین وہی ہوتا۔ وہ سب سے زیادہ ''فنکار'' تھا۔ سب سے زیادہ ہوشیار۔ اور یہ بھی کہ وہی تھا جو اپنی ماں سے سب سے زیادہ محبت کرتا تھا۔ وہی تھا، دوسرے لفظوں میں، جو اسے سب سے بہتر سمجھتا تھا۔ مجھے نہیں علم تھا، وہ کہتی، کہ ایک لڑکے سے اتنی زیادہ توقع کی جاسکتی ہے، اتنا ادراک، اتنی گہری شفقت۔

ہماری ایک دفعہ دوبارہ ملاقات ہوئی، اس نے مرحوم چھوٹے بھائی کے بارے میں باتیں کیں۔ اس نے کہا: کتنی بُری ہے یہ موت، یہ گھناؤنی ہے، ہمارا چھوٹا بھائی، ہمارا چھوٹا پاؤلو۔

ہماری آپس میں رشتہ داری کی ایک تصویر ذہن میں ابھرتی ہے: سادیک میں ایک کھانے کے دوران۔ ہم تینوں کھانے کی میز پر بیٹھے کھانا کھارہے ہیں۔ ان کی عمر سترہ، اٹھارہ سال ہے۔ ماں ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ وہ ہم دونوں کو کھانا کھاتے ہوئے دیکھ رہا ہے، چھوٹے بھائی کو اور مجھے، اور پھر وہ اپنا کانٹا میز پر رکھ دیتا ہے، اب وہ صرف میرے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ لمبے عرصے تک وہ اسے دیکھتا رہتا ہے اور پھر وہ اسے یکدم، بڑے اطمینان سے، کچھ خوفناک سی چیز کہتا ہے۔ جملہ کھانے کے بارے میں ہے۔ وہ اسے کہتا ہے کہ اسے محتاط رہنا چاہیئے، کہ اسے اتنا زیادہ نہیں کھانا چاہیئے۔ چھوٹا بھائی کوئی جواب نہیں دیتا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتا ہے۔ وہ اسے یاد

دلواتا ہے کہ گوشت کے بڑے ٹکڑے اس کے لئے ہیں، کہ اسے یہ نہیں بھولنا چاہیئے۔ نہیں تو، وہ کہتا ہے۔ میں پوچھتی ہوں: تمہارے لئے کیوں؟ وہ کہتا ہے: کیونکہ بس، یہ ایسا ہے۔ میں کہتی ہوں: میں چاہتی ہوں کہ تم مرجاؤ۔ میں اب کھانا نہیں کھاسکتی۔ چھوٹا بھائی بھی نہیں۔ وہ انتظار کرتا ہے کہ چھوٹا بھائی ایک لفظ ہی بولنے کی ہمت کرے، صرف ایک لفظ، میز کے اوپر اس کی مٹھی مضبوطی سے پہلے ہی بند ہے تاکہ وہ اس کے چہرے کو زور سے ضرب لگائے۔ چھوٹا بھائی کچھ نہیں کہتا۔ اس کا رنگ زرد ہے۔ اس کی پلکوں میں آنسو تیر رہے ہیں۔

جس دن وہ فوت ہوا، وہ اداس دن تھا۔ میرا خیال ہے، موسم بہار کا دن، اپریل میں۔ مجھے کسی کا فون آیا۔ کچھ نہیں، اس کے علاوہ کچھ نہیں کہا، کہ کسی نے اس کو مردہ پایا تھا، فرش پر، اپنے کمرے میں۔ اس کی کہانی ختم ہونے سے پہلے ہی موت اس تک پہنچ چکی تھی۔ اس کی زندگی میں ہی یہ کام ہوچکا تھا، اب بہت دیر ہوچکی تھی کہ وہ فوت ہو، موت تو اُسے میرے چھوٹے بھائی کی موت کے فوراً بعد ہی آ چکی تھی۔ تسخیر کرنے والے الفاظ، سب کچھ ختم ہوگیا۔

ماں نے کہا تھا کہ اس کو اس کے ساتھ ہی دفن کیا جائے۔ مجھے اب یاد نہیں کہ کس جگہ پر، کونسے قبرستان میں، میں صرف یہ جانتی ہوں کہ قبرستان لوآر کے علاقے میں واقع ہے۔ وہ دونوں اس مقبرے میں ہیں۔ صرف وہ

دونوں۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ہونا چاہیئے۔ ایک نابرداشت شان و شوکت کی تصویر۔

پورے سال کے دوران اندھیرا ایک ہی وقت پر چھاتا۔ یہ بہت مختصر ہوتا، تقریبا ایک جھٹکا۔ بارشوں کے موسم میں، ہفتوں تک آسمان دکھائی نہیں دیتا تھا، وہ ایسی یکساں دھند میں پھنسا ہوتا کہ چاند کی روشنی بھی اس میں سے نہیں گزر سکتی تھی۔ اس کے برخلاف خشک موسم میں آسمان بالکل صاف ہوتا، پورے کا پورا کسی بھی بادل کے بغیر، ننگا، یہاں تک کہ چاند کے بغیر بھی راتیں روشن ہوتی تھیں۔ اور زمین پر، پانی میں، سڑکوں پر، دیواروں پر سائے صاف دکھائی دیتے۔ مجھے دن کا وقت ٹھیک طرح سے یاد نہیں۔ سورج کی روشنی رنگوں کو دھندلا کر دیتی، انہیں نیست و نابود کر دیتی۔ راتیں، مجھے یاد ہیں۔ نیلا رنگ آسمان سے بھی زیادہ دور تھا، وہ ہر موٹائی کے پیچھے تھا، وہ دنیا کی گہرائیوں کو ڈھانپ دیتا تھا۔ آسمان میرے لئے خالص چمک کا ایک پھیلاؤ تھا جو نیلے رنگ میں سے گزر رہا تھا، ایک ایسا سرد امتزاج جو کسی بھی رنگ سے بالاتر تھا۔ کبھی کبھار، وِن لونگ میں، جب میری ماں اداس ہوتی، تو وہ گھوڑا تانگہ تیار کرنے کو کہتی اور ہم مضافاتی علاقوں میں خشک موسم کی رات دیکھنے کے لئے جاتے۔ یہ میری خوش قسمتی تھی، وہ راتیں، وہ ماں۔ روشنی آسمان سے خالص شفاف آبشار کی شکل میں گرتی، خاموش اور بے حرکت، تیز دھاروں کی

صورت میں۔ ہوا نیلی تھی، ایسے کہ اسے ہاتھوں میں لیا جاسکتا تھا۔ نیلی۔ آسمان روشنی کی جگمگاہٹ کی ایک مسلسل دھڑکن تھا۔ رات سب چیزوں کو روشن کردیتی تھی، سارے مضافاتی علاقوں کو، دریا کے دونوں کناروں پر جہاں تک نظر پہنچ سکے۔ ہر رات ایک خاص رات تھی، ہر رات کو اس کے گزرتے وقت میں ایک خاص نام دیا جاسکتا تھا۔ رات کی آواز دیہی علاقوں کے کتوں کی آواز تھی۔ وہ کسی رازِ پنہاں پر بھونکتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جواب دیتے حتی کہ رات کا تمام وقت اور خلا پوری طرح بھر جاتا۔

صحن کے راستے میں دارچینی کے درختوں کے سائے کالی سیاہی کی طرح ہیں۔ تمام کا تمام باغیچہ سنگ مرمر کی طرح ساکن ہے۔ گھر بھی، عظیم الشان، ماتمی۔ اور میرا چھوٹا بھائی میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے اور بڑے غور اور انہماک سے خالی سڑک پر کھلے دروازے کی طرف دیکھ رہا ہے۔

ایک دن وہ لیسے کے سامنے موجود نہیں تھا، کالی کار میں اکیلا شوفر ہی تھا، وہ مجھے بتاتا ہے کہ والد بیمار ہے، نوجوان مالک سادیک گیا ہوا ہے۔ اسے، شوفر کو، یہ حکم ملا ہے کہ وہ سائیگون میں رہے تاکہ وہ مجھے لیسے چھوڑے، اور واپس بورڈنگ سکول لے کے جائے۔ نوجوان مالک کچھ دنوں کے بعد واپس

آ گیا۔ ایک بار پھر وہ کالی کار میں پیچھے بیٹھا ہوا تھا، اور اس نے اپنی نگاہیں دوسری طرف کی ہوئی تھیں تا کہ وہ لوگوں کو اس کی طرف دیکھتے ہوئے نہ دیکھے، ہمیشہ کی طرح خوفزدہ۔ ہم نے ایک دوسرے کو بوسہ دیا۔ بوسہ دیتے ہوئے وہ رو رہا تھا۔ والد زندہ ہی رہے گا۔ اس کی آخری امید بھی ختم ہوگئی۔ اس نے اُس سے درخواست کی تھی، اس سے منت کی تھی کہ وہ اسے مجھے اپنے بدن سے لگائے رکھنے کی اجازت دے، اس نے اُس سے کہا کہ یقیناً وہ اس کی بات کو سمجھتا ہوگا، کہ اس نے اپنی لمبی زندگی میں خود بھی یقیناً ایک دفعہ تو ایسا ہی عشق کیا ہوگا، کہ یہ ناممکن تھا کہ ایسے نہ ہو، اس نے اس سے التجا کی تھی کہ وہ اُسے اب اُس کی باری جینے دے، ایک دفعہ، ایسا عشق، اس پاگل پن کو، چھوٹی گوری لڑکی کے ساتھ، اس دیوانگی کو، اُس نے اس سے کہا تھا کہ وہ اسے مزید وقت دے کہ وہ لڑکی سے محبت کرے اس سے پہلے کہ اسے واپس فرانس بھیجا جائے، اسے اُس کے ساتھ مزید چھوڑ دیا جائے، خواہ ایک سال ہی سہی، کیونکہ اس کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اس محبت کو خیر باد کہے، یہ ابھی نئی نئی محبت تھی، ابھی تک بہت شدید، اپنے پیدا ہوتے ہوئے تشدد میں بہت سخت، کہ اس کے جسم سے علیحدہ ہونا ابھی بہت بھیانک تھا، اور خاص طور پر اس وجہ سے بھی، جیسے کہ وہ جانتا تھا، وہ، والد، کہ ایسی محبت اُسے کبھی بھی دوبارہ نہیں ملے گی۔

والد نے دہرایا کہ اس سے بہتر ہوتا کہ وہ مرجائے۔

ہم دونوں نے اکٹھے مٹکوں کے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا، ہم نے ایک دوسرے کو بوسے دیئے، ہم روئے، اور پھر وہی موت تک پہنچانے والا پیار لیکن اس مرتبہ، جو لذت ملی وہ شروع سے ہی غمگین تھی۔ میں نے اسے کہا کہ اسے کسی قسم کا غم کرنے کی ضرورت نہیں، میں نے اسے یاد دلایا جو اس نے کہا تھا، کہ میں جہاں بھی ہوں گی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے چلی جاؤں گی، کہ میں اپنے رویے کے بارے میں خود فیصلہ نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے کہا کہ اب اس چیز کی بھی اس کے لئے کوئی اہمیت نہیں تھی، کہ اب کسی چیز کا بھی فرق نہیں پڑتا۔ پھر میں نے اس سے کہا کہ میں اس کے باپ کی رائے سے متفق ہوں، کہ میں اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی، میں نے کوئی وجوہات نہیں بتائیں۔

یہ وِن لونگ میں ان شاہراہوں میں سے ایک شاہراہ ہے جو دریائے میکونگ پر ختم ہوتی ہیں۔ یہ ایسی شاہراہ ہے جو رات کو ہمیشہ سنسان ہوتی ہے۔ اس شام جیسا کہ تقریباً ہر شام کو ہوتا ہے، بجلی بند ہوجاتی ہے۔ سب کچھ یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ یوں ہی میں شاہراہ تک پہنچتی ہوں کہ بڑا دروازہ میرے پیچھے بند ہوجاتا ہے، روشنی بند ہوجاتی ہے۔ میں دوڑنا شروع کردیتی ہوں۔ میں دوڑتی ہوں کیونکہ مجھے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے۔ میں تیز سے تیز تر دوڑنا شروع کردیتی ہوں۔ اور یک دم مجھے اپنے پیچھے کسی اور کے دوڑنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اور پھر فوراً مجھے یقین ہوجاتا ہے کہ کوئی

میرے پیچھے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ دوڑتے دوڑتے میں پیچھے مڑتی اور دیکھتی ہوں۔ یہ ایک بہت لمبی سی عورت ہے، بہت پتلی، موت کی طرح پتلی، جو قہقہے لگا رہی ہے اور دوڑ رہی ہے۔ اس کے پاؤں ننگے ہیں، وہ میرے پیچھے مجھے پکڑنے کے لئے بھاگ رہی ہے۔ میں اسے پہچان لیتی ہوں، یہ اس علاقے کی پاگل ہے، وِن لونگ کی پاگل۔ پہلی دفعہ میں اس کی آواز سنتی ہوں، وہ رات کو باتیں کرتی ہے، دن کے دوران وہ سوتی ہے، اور اکثر وہیں اسی شاہراہ پر باغ کے سامنے۔ وہ دوڑتی دوڑتی ایک ایسی زبان میں چیخیں مار رہی ہے جسے میں نہیں جانتی۔ مجھے اتنا زیادہ خوف ہے کہ میں اسے بلا بھی نہیں سکتی۔ میری عمر کوئی آٹھ سال ہوگی۔ مجھے اس کے قہقہے اور خوشی کی چیخیں سنائی دے رہی ہیں، یقیناً وہ مجھ سے کھیل کر مزے لے رہی ہے۔ میری یاد ایک مرکزی خوف کی ہے۔ یہ کہنا کہ یہ خوف میری سمجھ، میری طاقت سے باہر ہے، کافی نہیں ہے۔ جو بات یقینی ہے، وہ میرے پورے کے پورے وجود کا یقین کلی ہے کہ اگر اس عورت نے مجھے چھوا، خواہ ہلکے سے ہی، اپنے ہاتھ سے، تو میں موت سے بھی خراب تر حالت میں پہنچ جاؤں گی، دیوانگی کی حالت میں۔ میں ہمسایوں کے باغیچے تک پہنچ جاتی ہوں، اپنے گھر تک، میں دوڑتے ہوئے سیڑھیاں چڑھتی ہوں اور دروازے میں گر پڑتی ہوں۔ پھر کئی دنوں تک مجھ میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ میں کچھ بھی بتا سکوں کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔

زندگی کے اس بتاخیر زمانے میں بھی مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں میری ماں کی حالت اتنی خراب نہ ہوجائے، میں اس حالت کو ابھی تک کوئی نام نہیں دیتی، کہ جس کی وجہ سے اسے اپنے بچوں سے علیحدہ کرنا پڑے۔ میرا خیال ہے کہ یہ مجھے خود ہی جانچنا پڑے گا جب وہ دن آئے گا، میرے بھائیوں کو نہیں، کیونکہ میرے بھائی اس حالت کو نہیں جانچ سکیں گے۔

ہماری حتمی علیحدگی سے کچھ ماہ پہلے کی بات ہے، سائیگون میں، شام کے آخری وقت، ہم تیتار روڈ کے گھر کی بڑی بالکونی پر کھڑے تھے۔ وہاں دو بھی تھی۔ میں نے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ میں اسے ٹھیک طرح سے پہچان نہیں سکی۔ اور پھر ایک قسم کا یکدم غائب ہونے کا، گرنے کا عمل، میں یک لخت اس کو بالکل نہیں پہچان سکی۔ وہاں فوراً، میرے نزدیک، میری ماں کی جگہ ایک اور عورت بیٹھی ہوئی تھی، وہ میری ماں نہیں تھی، اس کی شکل ماں جیسی ہی تھی، لیکن وہ میری ماں بالکل نہیں تھی۔ وہ کچھ کچھ خالی الذہن سی لگ رہی تھی، وہ تفریح گاہ کی طرف دیکھ رہی تھی، تفریح گاہ کے ایک خاص حصہ کی طرف، یوں لگتا تھا جیسے کہ وہ کسی یکدم ہونے والے واقعہ کی تاک میں تھی، جس کے بارے میں مجھے قطعی طور پر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ خاموش طبعی کی وجہ سے، اس کے خدوخال، نگاہوں میں جوانی تھی، ایک ایسی خوشی جسے وہ اپنی عادت کے مطابق دبا رہی تھی۔ وہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ دو اس کے ساتھ

بیٹھی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ دو نے کچھ محسوس نہیں کیا۔ دہشت یہ نہیں تھی جس کے بارے میں میں نے ذکر کیا ہے، اس کے خدوخال، اس کے خوش ہونے کے آثار، اس کی خوبصورتی، دہشت اس وجہ سے تھی کہ وہ ٹھیک اسی جگہ بیٹھی ہوئی تھی جہاں میری ماں بیٹھی ہوئی تھی جب یہ بدل عمل میں آیا، کہ میں جانتی تھی کہ اس کے علاوہ اس کی جگہ کوئی دوسرا نہیں تھا، لیکن من وعن وہ شناخت جس کی جگہ کوئی دوسرا نہیں لے سکتا تھا، وہ غائب ہوگئی تھی اور میرے پاس کوئی طاقت نہیں تھی جس سے وہ واپس آجائے، یا واپس آنا شروع ہوجائے۔ کچھ نہیں تھا جو اس کی تصویر میں بسے۔ میں پوری طرح ہوش میں ہوتے ہوئے بھی دیوانی ہوگئی۔ اتنے وقت کے لئے کہ چیخ سکوں۔ اور میں چیخی بھی۔ ہلکی سی چیخ، مدد کے لئے پکارتا کہ اس برف کو توڑ سکوں جس میں یہ سارا منظر تباہ کن انداز میں منجمد ہورہا تھا۔ ماں نے اپنا سر موڑا۔

میرے لئے سارا شہر بھیک مانگنے والی، شاہراہ والی بھکاری عورت سے آباد ہے۔ شہروں کی تمام بھکاری عورتیں، چاولوں کے کھیتوں والی، سیام کے ساتھ ساتھ جاتے ہوئے راستوں والی، دریائے میکونگ کے کناروں والی، میں نے ان تمام جگہوں میں اس بھکاری عورت کو آباد کردیا جس سے مجھے ڈر لگتا تھا۔ وہ ہر جگہ سے آتی ہے۔ وہ ہمیشہ کلکتہ پہنچتی تھی خواہ وہ کہیں سے بھی آئے۔ وہ ہمیشہ کھیل کے میدان میں دارچینی کے درختوں کے سائے میں

سوتی تھی۔ ہمیشہ میری ماں اس کے ساتھ ہوتی، اس کے سنڈیوں کے کھائے ہوئے اور مکھیوں سے بھرے ہوئے پاؤں کی دیکھ بھال کرتے ہوئے۔ اس کے ساتھ کہانی والی چھوٹی لڑکی۔ وہ اسے دو ہزار کلومیٹر سے ساتھ لیئے پھر رہی ہے۔ وہ اس سے سخت تنگ آ چکی ہے، وہ اسے کسی کو دینا چاہتی ہے، لے لو اِسے، اب کوئی بچّے نہیں، کوئی بچّہ بھی۔ تمام فوت ہوگئے یا پھینک دیئے گئے، زندگی کے اختتام پر۔ وہ جو دارچینی کے درختوں کے نیچے سو رہی ہے، وہ ابھی فوت نہیں ہوئی۔ وہ سب سے زیادہ لمبے عرصہ تک زندہ رہے گی۔ وہ اپنے گھر کے اندر فوت ہوگی، اپنے جالی کے لباس میں۔ اس کے لئے لوگ ماتم کریں گے۔

وہ چاولوں کے کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر چل رہی ہے جو راستے کے دونوں طرف ہیں، وہ چیخ رہی ہے، اور وہ زور زور سے قہقہے لگا رہی ہے۔ اس کی ہنسی سونے جیسی ہے، مردہ لوگوں کو جگانے والی، کسی کو بھی جگانے والی جو بچوں کو ہنستے ہوئے سنتا ہے۔ وہ بنگلوں کے سامنے باہر دنوں کھڑی رہتی ہے، ان بنگلوں میں گورے لوگ رہتے ہیں، اسے یاد ہے، وہ بھکاریوں کو کھانے پینے کے لئے دیتے ہیں۔ اور پھر ایک دن، دیکھیئے، وہ، پو پھٹتے ہی جاگ اٹھتی ہے اور چلنا شروع کردیتی ہے، ایک دن وہ وہاں سے چلے جاتی ہے، خدا جانتا ہے کیوں، وہ پہاڑوں کی طرف مڑتی ہے، وہ جنگل کو پار کرتی ہے اور وہ ان راستوں پر چلتی ہے جو سیام کے پہاڑوں کی چوٹیوں کے ساتھ ساتھ جا رہے

ہیں۔ شاید اس وجہ سے کہ اس نے میدان مرتفع کی دوسری طرف زرد اور سبز آسمان دیکھا ہے، وہ میدان کو پار کرنا شروع کردیتی ہے اور پھر آخر میں وہ سمندر کی طرف نیچے چلنا شروع کردیتی ہے۔ وہ اپنے مریل بڑے بڑے قدموں سے جنگل کی ڈھلوانوں سے نیچے اترتی ہے۔ وہ چلتی رہتی ہے، چلتی رہتی ہے۔ یہ جنگل طاعون سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہ علاقے سخت گرم ہیں۔ یہاں سمندر کی صحت بخش ہوا نہیں ہے۔ یہاں پر مچھروں کا غیر متحرک شور ہے، مردہ بچے ہیں۔ ہر روز کی بارش، اور پھر یہ ہیں ڈیلٹا۔ یہ کرۂ زمین کے سب سے بڑے ڈیلٹا ہیں۔ یہ کالے کیچڑ کے بنے ہوئے ہیں۔ وہ چٹاگانگ کی طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ اس نے پگڈنڈیوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے، جنگلوں کو، چائے کے باغوں کے راستوں کو، سرخ سورجوں کو، اور وہ ڈیلٹا کی خلیج کی طرف آگے بڑھتی ہے۔ وہ اسی طرف جارہی ہے جس طرف دنیا، گھیر بندی کی طرف، ہمیشہ کی طرح دور، مشرق کی طرف۔ ایک دن وہ سمندر کے کنارے پہنچ جاتی ہے۔ وہ چیختی ہے، وہ اپنی پرندے والی پُرمعجزہ کوک سے قہقہے لگاتی ہے۔ اپنے قہقہوں کی وجہ سے اسے چٹاگانگ میں وہاں سے گزرتی ہوئی ایک بادبانی کشتی مل جاتی ہے، مچھیرے اس کو ساتھ لے جانے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں، وہ ان کے ساتھ خلیج بنگال کو پار کرتی ہے۔ پھر وہ، پھر وہ کلکتہ کے مضافات کے کوڑے کرکٹ کے انبار کے نزدیک رہنا شروع کردیتی ہے۔

اور پھر وہ دکھائی نہیں دیتی۔ اور پھر وہ دوبارہ دکھائی دیتی ہے۔ وہ اسی

شہر میں فرانسیسی سفارت خانہ کے پیچھے رہتی ہے۔ وہ ایک تفریح گاہ میں سوتی ہے، لاانتہا کھانے سے سیر ہوکر۔

وہ رات کو وہاں ہی رہتی ہے۔ پھر صبح ہونے پر دریا گنگا پر۔ ہمیشہ ہنستی ہے اور تضحیک آمیز مزاج کے ساتھ۔ وہ وہاں سے کہیں اور نہیں جاتی۔ وہاں وہ کھانا کھاتی ہے، سوتی ہے، رات کو یہاں سکون ہوتا ہے، وہ یہاں کنیر کی جھاڑیوں والی تفریح گاہ میں رہتی ہے۔

ایک دن میں وہاں جاتی ہوں، میں وہاں سے گزر رہی ہوں۔ میں سترہ سال کی ہوں۔ اس علاقے میں انگلستان کے لوگ رہتے ہیں، سفارت خانوں کے باغیچے ہیں، یہ موسم مون سون کا ہے، ٹینس کھیلنے والے میدان خالی ہیں۔ دریائے گنگا کے کنارے پر کوڑھ کے مریض کھڑے قہقہے لگا رہے ہیں۔

ہم یہاں کلکتہ میں سفر کے دوران رکے ہیں۔ ہمارے بحری جہاز کا انجن خراب ہوگیا ہے۔ ہم وقت گزارنے کے لئے شہر کی سیر کر رہے ہیں۔ ہم نے اگلی شام کو وہاں سے روانہ ہونا ہے۔

ساڑھے پندرہ سال۔ سادیک میں یہ خبر بڑی تیزی سے پھیل جاتی ہے۔ صرف لباس سے ہی بے عزتی کا پتہ چل جاتا ہے۔ ماں کو کسی بھی چیز کا ہوش نہیں، اور نہ ہی ایک چھوٹی لڑکی کی پرورش کرنے کا طریقہ۔ بے چاری بچی۔ کیا سمجھتے ہیں آپ، یہ ہیٹ معصوم نہیں ہے، اور نہ ہی سرخی، ان سب چیزوں

کا کچھ مطلب ہے، یہ اپنی طرف نظریں متوجہ کرنے کیلئے ہے، دولت کو۔ بھائی، وہ دونوں بدمعاش ہیں۔ سنا ہے کہ وہ آدمی چینی ہے، ایک ارب پتی کا بیٹا، دریائے میکونگ کے کنارے پر بنگلا، نیلی ٹائلوں کا بنا ہوا۔ وہ بھی بجائے اس کو اپنی عزت سمجھنے کے، وہ لڑکی کو اپنے بیٹے کے لئے نہیں چاہتا۔ یہ تو گورے بدمعاشوں کا خاندان ہے۔

اسے سب لوگ لادام، خاتون، کہہ کر پکارتے تھے، وہ سوانا کھیت سے یہاں آئی تھی۔ اس کے خاوند کی وِن لونگ میں تعیناتی ہوئی تھی۔ ایک سال کے عرصے کے دوران وہ یہاں دکھائی نہیں دی تھی۔ اس نوجوان کی وجہ سے، سوانا کھیت کا ڈپٹی ایڈمنسٹریٹر۔ اب ان دونوں کا عشق جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ تو نوجوان نے پستول کی گولی سے خودکشی کرلی۔ یہ کہانی وِن لونگ تک پہنچ چکی ہے۔ اس کی سوانا کھیت سے وِن لونگ کی روانگی کے دن، دل کے اندر ایک گولی۔ دن دیہاڑے قصبہ کے چوراہے میں۔ اپنی چھوٹی بیٹیوں اور خاوند کی وِن لونگ میں تبادلے کی وجہ سے اس نے نوجوان کو کہا تھا کہ اب یہ سب کچھ ختم ہوجانا چاہیئے۔

ملاقاتیں چولون کے بدنام علاقے میں ہوتی ہیں، ہر شام۔ ہر شام یہ چھوٹی رنڈی ایک گندے چینی لکھ پتی سے اپنا جسم سہلواتی ہے۔ وہ اسی لیسے

میں ہی پڑھتی ہے جہاں دوسری گوری لڑکیاں پڑھتی ہیں، گوری کسرتی بدن والی لڑکیاں جو سپورٹس کلب کے سوئمنگ پول میں چھاتی کے بل تیراکی کرنا سیکھتی ہیں۔ ایک دن ان کو حکم ملے گا کہ وہ سادیک کی استانی کی بیٹی کے ساتھ بولنا بند کر دیں۔

کھیلوں کے وقفے میں وہ اکیلی، ایک کھمبے کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی، باہر گلی کی طرف دیکھ رہی ہے۔ وہ اس بارے میں اپنی ماں کو کچھ نہیں بتاتی۔ وہ بدستور چولون کے چینی آدمی کی کالی لیموزین میں سکول آتی ہے۔ وہ لڑکیاں اسے جاتے ہوئے دیکھتی ہیں۔ کسی بھی استثنا کے بغیر۔ ان میں سے کوئی بھی اس سے بات نہیں کرے گی۔ یہ تنہائی اس کے ذہن میں وِن لونگ کی خاتون کی یاد ابھارتی ہے۔ اس کی عمر، اس وقت، ابھی بھی 38 سال کی ہوئی تھی۔ اور بچی کی عمر اس وقت دس سال۔ اور پھر اب 16 سال جب اسے وہ یاد آتی ہے۔

وہ خاتون اپنے کمرے کی بالکونی پر ہے اور دریائے میکونگ کے ساتھ ساتھ شاہراہوں کی طرف دیکھ رہی ہے، مجھے وہ دکھائی دیتی ہے جب میں اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ مذہبی تعلیم کا سبق لے کر واپس آتی ہوں۔ کمرہ ایک بہت بڑے محل کے درمیان میں ہے جس کی بالکونیوں کے اوپر چھت ہے، محل تاڑ کے درختوں اور کنیر کی جھاڑیوں کے ایک باغ کے بیچ میں ہے۔ ایک ہی فرق ہے جو اس خاتون اور فیلٹ ہیٹ والی لڑکی کو اس شہر کے

دوسرے لوگوں سے جدا کرتا ہے۔ جیسے کہ وہ دونوں دریا کے ساتھ ساتھ شاہراہوں کی طرف دیکھتی ہیں، ایسے ہی دونوں خود ہیں۔ دونوں ہی تنہا، دونوں اکیلی، ملکاؤں کی طرح۔ دونوں کی بدنامی تو ہے ہی۔ دونوں کی قسمت بدنامی ہے کیونکہ ان کے جسم ہی ایسے ہیں، جنہیں عاشق چمکارتے ہیں، جنہیں ان کے لب چومتے ہیں، اور وہ دونوں موت کی حد تک لے جانے والی رسوا کن لذت کی وجہ سے، جیسے کہ وہ کہتی ہیں، بے عشق عاشقوں کی اس پُراسرار موت سے مرجانا۔ یہ سارا معاملہ اسی وجہ سے ہے: اس موت کی آرزو کی وجہ سے۔ یہ ان کے اندر سے وارد ہوتی ہے، ان کے کمروں سے، اتنی طاقت ور موت کہ پورا شہر اس کے وجود کے بارے میں جانتا ہے، مضافات کی تمام آبادیاں، صوبائی دارالخلافے، تمام سرکاری تقریبیں، آہستہ رفتار والے رقص کی محفلیں۔

اس خاتون نے ابھی ابھی سرکاری تقریبوں میں حصہ لینا شروع کردیا ہے، اس کا خیال ہے کہ پرانا معاملہ ختم ہوگیا ہے، کہ سوانا کھیت کا نوجوان آدمی بھول بھلایا جاچکا ہے۔ تو اس خاتون نے یہ شام کی پارٹیاں دینا دوبارہ شروع کردیا جو اس کا فرض بنتا ہے تاکہ کم از کم لوگوں کو آپس میں ملنے کا موقع تو ملے، کبھی کبھار، اور کبھی کبھار دور دراز علاقوں میں کام کی اس وحشت ناک تنہائی سے بھی نکلنے کے لئے، چاولوں کے چوکور کھیتوں کے پھیلاؤ میں، خوف میں، دیوانگی میں، بخار میں، فراموشکاری میں۔

شام کو، سکول ختم ہونے پر، وہی کالی لیموزین، وہی بچوں والا اور گستاخ ہیٹ، وہی طلے والے جوتے اور وہ، وہ وہاں جاتی ہے، وہ وہاں جاتی ہے جہاں وہ ارب پتی چینی اس کے جسم کو برہنہ کرے گا، وہ اسے پانی کے فوارہ کے نیچے غسل دے گا، بہت دیر تک، جیسے کہ وہ اپنی ماں کے ہاں کیا کرتی تھی، ایک مٹکے کے ٹھنڈے پانی کے ساتھ جو چینی آدمی نے اس کے لئے رکھا ہوا ہے، اور پھر وہ اس کو بھیگے جسم کے ساتھ بستر تک اٹھا کے لے جائے گا، وہ پنکھا چلائے گا، اور وہ اسے ہر جگہ پر زیادہ سے زیادہ تر چومنا شروع کرے گا اور وہ ہمیشہ کی طرح اسے دوبارہ اور پھر دوبارہ کرنے کے لئے کہے گی، اور اس کے بعد وہ واپس بورڈنگ سکول جائے گی، اور کوئی بھی نہیں جو اسے سزا دے، اسے مارے پیٹے، اس کا چہرہ بگاڑے، اسے گالی گلوچ دے۔

اس نے رات کے اختتام پر اُپنے آپ کو مار ڈالا تھا، شہر کے بڑے چوراہے میں جو روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ وہ رقص کررہی تھی۔ اور پھر دن کی روشنی آئی۔ جسم کے نزدیک سے گزری۔ پھر، وقت گزرنے کے ساتھ، سورج کی روشنی نے اس کی صورت کو دھندلا کردیا تھا۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ لاش کے نزدیک جائے۔ پولیس والے یہ کام کریں گے۔ بارہ بجے دوپہر، جب سیاحوں کا بحری جہاز آئے گا، تو وہاں کچھ نہیں ملے گا، چوراہا صاف ستھرا

ہوگا۔

میری ماں نے بورڈنگ سکول کی سربراہ کو کہا: اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا، ان سب چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے، آپ نے دیکھا؟ یہ استعمال شدہ فراک، یہ گلابی ہیٹ، اور یہ طلے کے جوتے، اس پر کتنی سجتی ہیں یہ تمام چیزیں؟ ماں خوشی سے پاگل ہوتی ہے جب وہ اپنے بچوں کے بارے میں باتیں کرتی ہے اور پھر تو اس کی کشش مزید بڑھ جاتی ہے۔ بورڈنگ سکول کی جوان استانیاں ماں کی باتوں کو بڑے انہماک سے سنتی ہیں۔ یہ تمام لوگ، ماں کہتی ہے، اس کے ارد گرد گھومتے ہیں، شہر کے تمام مرد، شادی شدہ یا نہیں، وہ اس کے ارد گرد گھومتے ہیں، انہیں اس بچی کی خواہش ہے، اس چیز کی، جو ابھی تک پوری طرح مکمل نہیں ہے، دیکھیں تو آپ، ابھی تو وہ بچی ہے۔ لوگ بدنامی کی بات کرتے ہیں؟ اور میں کہتی ہوں: معصومیت کیسے بدنام ہوسکتی ہے؟

ماں بولتی رہتی ہے، بولتی رہتی ہے۔ وہ کھلم کھلا عصمت فروشی کی بات کرتی ہے اور وہ ہنستی ہے، بدنامی کی، مسخرے پن کی، غلط طریقے سے رکھے ہوئے ہیٹ کے بارے میں، اس بچی کی اعلیٰ شائستگی کی جو دریا کو پار کرتی ہے، اور پھر وہ ان فرانسیسی کالونیوں میں، اس ناقابل مزاحمت چیز پر ہنستی ہے۔ میں بات کررہی ہوں، وہ کہتی ہے، اس گوری رنڈی کی، اس بچی کی جو اب تک

اندرون ملک کی دُور افتادہ بستی میں چھپی ہوئی تھی، اور جو یک دم دن کی روشنی میں نمودار ہوتی ہے اور تمام لوگوں کے سامنے اس قابل نفرت چینی کروڑ پتی کے ساتھ ناجائز جنسی تعلقات قائم کرتی ہے، انگلی میں ہیرا ایسے جیسے کہ وہ کسی بینکار کی جوان بیوی ہے۔ اور پھر وہ رونا شروع کر دیتی ہے۔

جب اُس نے ہیرے کو دیکھا تو ہلکی سی آواز میں اس نے کہا: اس سے مجھے میری پہلے خاوند سے منگنی کی یک نگی انگوٹھی کا چھوٹا سا ہیرا یاد آتا ہے۔ میں کہتی ہوں: کالے صاحب۔ ہم دونوں ہنستے ہیں۔ یہ اس کا نام تھا، وہ کہتی ہے، یہ واقعی سچی بات ہے۔

ہم کافی دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر جب وہ بہت میٹھے سے انداز میں مسکرائی، کچھ کچھ مسخرے پن سے، جو اس کے اپنے بچوں کے بارے میں گہرے علم کی نشانی تھی اور اس کے بارے میں بھی جو کچھ ان کے ساتھ مستقبل میں پیش آنے والا تھا، تو میں اسے چولون کے بارے میں بتانے والی ہی تھی۔

لیکن میں نے اسے نہیں بتایا۔ میں نے اسے کبھی بھی نہیں بتایا۔

پھر وہ مجھ سے دوبارہ بولنے سے پہلے بہت دیر تک انتظار کرتی رہی، اور پھر جب وہ بولی تو بہت پیار کے ساتھ: یہ تم جانتی ہو نا کہ اب سب کچھ ختم ہو چکا ہے؟ کہ اب تم اس کالونی میں کبھی بھی شادی نہیں کرسکوگی۔ میں اپنے

کندھے اچکاتی ہوں، میں ہنستی ہوں۔ میں کہتی ہوں: میں کسی بھی جگہ شادی کرسکتی ہوں، جب بھی میں چاہوں۔ میری ماں اشارہ کرتی ہے کہ نہیں، نہیں۔ وہ کہتی ہے: یہاں ہرکوئی ہر بات جانتا ہے، یہاں تم شادی نہیں کرسکوگی۔ وہ میری طرف دیکھتی ہے اور نہ بھولنے والی باتیں کرتی ہے: کیا تمہیں یہ لوگ پُرکشش پاتے ہیں؟ میں جواب دیتی ہوں: بالکل ٹھیک، یہ لوگ مجھے پُرکشش پاتے ہیں، ہر چیز کے باوجود۔ اس پر وہ کہتی ہے: یہ لوگ تمہیں تمہاری اپنی وجہ سے پسند کرتے ہیں۔

وہ مجھ سے مزید پوچھتی ہے: کیا تم اس سے صرف اس کی دولت کی وجہ سے ملتی ہو؟ میں کچھ ہچکچاتی ہوں اور پھر میں کہتی ہوں کہ یہ صرف دولت کے لئے ہی ہے۔ وہ کافی دیر تک میری طرف دیکھتی رہتی ہے، وہ میری بات پر یقین نہیں کرتی۔ وہ کہتی ہے: میں تمہاری طرح نہیں تھی، مجھے پڑھائی میں تم سے زیادہ دقت ہوئی تھی اور میں بہت سنجیدہ مزاج تھی، اور میں بہت عرصہ تک ایسی ہی رہی، بہت دیر تک، میں نے اپنی خوشی کا مزا لینا کھودیا ہے۔

یہ سادیک میں چھٹی کا دن تھا۔ وہ ایک جھولنے والی کرسی پر آرام کررہی تھی، اپنے پاؤں ایک کرسی پر رکھے ہوئے، اس نے بیٹھک اور کھانے والے کمرہ کے دروازے ہوا دینے کے لئے کھولے ہوئے تھے۔ وہ بہت پُرامن تھی، غصہ میں نہیں۔ یکدم اُس نے اپنی بچی کو دیکھا اور اسے اس کے ساتھ باتیں کرنے کی خواہش ہوئی۔

ہم اختتام ہونے سے زیادہ پہلے زمانے میں نہیں تھے، بیراج کی زمین کو چھوڑ دینے سے پہلے۔ فرانس روانگی کے وقت سے پہلے۔
میں نے اس پر نیند کا غلبہ آتے ہوئے دیکھا۔

کبھی کبھی میری ماں اعلان کرتی ہے: کل ہم فوٹوگرافر کے ہاں جائیں گے۔ وہ قیمت کی شکایت کرتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ خاندان کی تصویروں کے لئے خرچہ کرتی ہے۔ ان تصویروں کو ہم دیکھتے ہیں، ہم ایک دوسرے کو نہیں دیکھتے لیکن تصویروں کو دیکھتے ہیں، ہر کوئی علیحدہ علیحدہ، کوئی بھی تبصرہ کیئے بغیر، ہم انہیں دیکھتے ہیں، ہم اپنے آپ کو دیکھتے ہیں۔ ہم خاندان کے دوسرے لوگوں کو ایک ایک یا اکٹھے دیکھتے ہیں۔ ہم پرانی تصویروں میں اپنے آپ کو دیکھتے ہیں جب ہم بہت چھوٹے تھے اور پھر اپنے آپ کو حالیہ تصویروں میں دیکھتے ہیں۔ ہمارے درمیان علیحدگی مزید بڑھ گئی ہے۔ جب ہم انہیں دیکھ لیتے ہیں تو تصویروں کو چادروں کے ساتھ واپس الماریوں میں رکھ دیا جاتا ہے۔ ہماری ماں ہماری تصویریں کھنچواتی ہے تاکہ وہ ہمیں دیکھ سکے، دیکھ سکے کہ ہم عام معیار کے مطابق بڑے ہورہے ہیں۔ وہ ہمیں دیر تک دیکھتی رہتی ہے، دوسری ماؤں کی طرح، دوسرے بچوں کی طرح۔ وہ تصویروں کا ایک دوسری سے موازنہ کرتی ہے، وہ ہر کسی کی افزائش کے بارے میں باتیں کرتی ہے۔ کوئی اسے جواب نہیں دیتا۔

ماں بچوں کے علاوہ کسی اور چیز کی تصویریں نہیں کھنچواتی تھی۔ کبھی بھی کسی اور چیز کی نہیں۔ میرے پاس وِن لونگ کی تصویریں نہیں ہیں، ایک بھی نہیں، باغ کی، دریا کی، فرانسیسی فتح کے زمانے کی سیدھی شاہراہوں پر املی کے درختوں کی قطاروں کی، کوئی تصویر نہیں، گھر کی، ہمارے پاگل خانوں جیسے سفیدی کئے ہوئے کمرے، لوہے کے کالے اور سنہری ملمع چڑھے بڑے بڑے بستر، کمرے جو سکول کے کمروں کی طرح کے سرخ بلبوں سے روشن ہیں، دھات کے بنے ہوئے ہرے رنگ کے لیمپ کے ہنڈے، ایک بھی نہیں، ان ناقابل یقین جگہوں کی ایک بھی تصویر نہیں، ہمیشہ عارضی، ناقابل بیان طریقے سے بدصورت، کہ فرار ہونے ہونے کو دل چاہے، جن میں میری ماں نے ڈیرہ لگایا تھا، جب تک، وہ کہتی تھی، وہ ٹھیک طرح کسی جگہ مستقل سکونت اختیار نہیں کرتی، لیکن فرانس میں، ان علاقوں میں، جن کے بارے میں اس نے ساری زندگی باتیں کیں، اور جو اس کی کیفیتِ مزاج، اس کی عمر، اس کی افسردگی کے مطابق پادے کالے اور لانتر دومیر میں واقع تھے۔ جب وہ ہمیشہ کے لئے ایک جگہ ٹھہرے گی، جب وہ لوار کے علاقے میں رہائش پذیر ہوگی، تو اس کا کمرہ سادیک کے کمرے کی ہو بہو نقل ہوگا۔ وہ بھول چکی تھی۔

اس نے کبھی جگہوں کی، مقامات کی تصویریں نہیں کھنچوائیں، صرف ہماری، اس کے بچوں کی، اور زیادہ تر وہ ہمیں گروپ میں اکٹھا کرتی تاکہ خرچہ

کم ہو۔ تھوڑی سی شوقیہ تصویریں جو ہماری لی گئی تھیں وہ تصویریں ہماری ماں کے دوستوں نے کھینچی تھیں، کالونیوں میں نئے نئے آئے ہوئے ہمکار جو استوائی قدرتی نظاروں، ناریل کے درختوں اور گلیوں کی تصویریں کھینچتے تاکہ وہ اپنے خاندان کو بھجوائیں۔

کسی پُراسرار وجہ کی بنا پر میری ماں اپنے بچوں کی تصویریں چھٹیوں میں اپنے خاندان کو دکھاتی ہے۔ ہم اس خاندان کو ملنے نہیں جانا چاہتے۔ میرے بھائیوں کی ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ میں، چونکہ میں سب سے چھوٹی تھی، شروع شروع میں مجھے وہ اپنے ساتھ لے جاتی۔ اور پھر میں نے بھی جانا بند کردیا، کیونکہ میری خالائیں میرے رسوا کن رویے کی وجہ سے یہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی بیٹیوں سے میری ملاقات ہو۔ اس لئے ماں کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ صرف ہماری تصویریں ہی دکھائے، تو میری ماں تصویریں دکھاتی ہے، توقع کے مطابق اور از روئے منطق وہ اپنی، اپنے بچوں کی تصویریں دکھاتی ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ یہ کرے، تو وہ یہ کرتی ہے، صرف یہ خالہ زاد ہی ہیں جو کہ خاندان میں رہ گئی ہیں، تو وہ انہیں اپنے خاندان کی تصویریں دکھاتی ہے۔ کیا اس طریقہ سے رہنے کے اس انداز سے اس عورت کے بارے میں کچھ پتہ چلتا ہے؟ اُس کے اس مزاج کے ذریعے جو بغیر سوچے ہوئے کہ وہ یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ دے، اپنی خالہ زاد بہنوں کو، اس محنت کو، اس بوجھ کو، ہر چیز کے تلخ اختتام تک پہنچنا ہے؟ میں سمجھتی ہوں کہ

ہاں۔ یہی انسانی دلیری ہے، بے معنی، جس میں مجھے سچی اخلاقی توانائی دکھائی دیتی ہے۔

جب وہ بوڑھی تھی، سفید بالوں والی، وہ بھی فوٹوگرافر کے پاس گئی، وہ وہاں اکیلی گئی، اس نے اپنی فوٹو گراف کھنچوائی، اپنے خوبصورت گہرے سرخ رنگ کے فراک اور اپنے دو زیورات: اپنے لاکٹ اور اپنے سونے میں جڑے، چھوٹے گول یشمِ سبز کے بروچ کے ساتھ۔ فوٹو گراف میں اس کے بال اچھی طرح سے سنوارے ہوئے ہیں، کپڑوں پر ایک بھی سلوٹ نہیں، مجسمۂ تصویر۔ کھاتے پیتے مقامی لوگ بھی فوٹوگرافر کے پاس جاتے تھے، زندگی میں صرف ایک مرتبہ، جب انہیں موت نزدیک آتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ تصویریں بڑی تھیں، وہ سب ایک ہی جسامت کی تھیں، وہ سب خوبصورت سنہرے فریموں میں لگی تھیں اور آباؤ اجداد کی یادگار کے قریب لٹکی ہوئی تھیں۔ ان تمام لوگوں کی تصویریں، اور میں نے ایسی بہت سی دیکھی ہیں، تمام کی تمام تقریباایک ہی تصویر کی طرح دکھائی دیتی تھیں، ان کی آپس میں مشابہت واہمی تھی۔ صرف یہ بات نہیں کہ بڑھاپے میں سب ایک سے لگتے ہیں، ایسا ہے کہ پورٹریٹ ہمیشہ آراستہ کئے جاتے تھے اور اس طریقہ سے کہ چہرے کی خصوصیات، اگر ابھی کچھ بچ رہتی تھیں، انہیں لطیف بنادیا جاتا تھا۔

تمام چہرے ابدیت کامقابلہ کرنے کے لئے ایک ہی طریقہ سے تیار کئے

جاتے تھے، انہیں معتدل کیا جاتا تھا، یکساں طریقہ سے جوانی بحال کئے ہوئے۔ لوگ یہی چاہتے تھے۔ یہ مشابہت، یہ شعور، ان کے خاندان کے بیچ میں گزرنے کی یادداشت تھی، جوکہ بیک وقت اس کی انفرادیت اور اُس کی حقیقت کی شہادت دیتی تھی۔ جتنی زیادہ ان کی آپس میں مشابہت ہوتی، اتنی زیادہ اس امر کا ثبوت ہوتی کہ وہ خاندان کا حصہ تھے۔ اس کے علاوہ تمام مردوں نے ایک ہی قسم کی پگڑی پہنی ہوتی ،اور عورتوں نے ایک ہی قسم کا جوڑا، ایک ہی طرز سے کھینچ کر بنائے گئے بال، اور مردوں اور عورتوں نے ایک ہی قسم کے اٹھے ہوئے کالر کے لباس پہنے ہوتے۔ اُن کے چہرے پر ایسے ہی جذبات اور تاثرات ہوتے جو آج تک میں کہیں بھی پہچان سکتی ہوں۔ اور میری ماں کے چہرے پر بھی اُس سرخ لباس والی تصویر میں اس قسم کے تاثرات تھے جیسے کہ ان کے، پُرشکوہ، کچھ لوگ کہیں گے، اور خلوت گزیں، کچھ دوسرے۔

وہ اس بارے میں مزید کبھی بات نہیں کرتے۔ یہ بات پکی ہے، کہ وہ اُس سے شادی کرنے کے لئے اپنے والد کے ساتھ مزید کوئی کوشش نہیں کرے گا۔ کہ والد اپنے بیٹے پر کسی قسم کا ترس نہیں کھائے گا۔ وہ کسی کے لئے بھی ترس نہیں کھاتا۔ چین سے آئے ہوئے تمام لوگوں میں، جن کے ہاتھوں میں اس شہر کا کاروبار ہے، نیلی اینٹوں والی بالکونیوں والا سب سے زیادہ سخت

گیر ہے، سب سے زیادہ دولت مند، اور جس کی جائداد سادیک سے باہر دور دراز علاقوں تک پھیلی ہوئی ہے، چولون تک، جوکہ فرانسیسی ہند چین کا دارالخلافہ ہے۔ چولون والا آدمی جانتا ہے کہ اس کے والد اور اس بچی کا فیصلہ ایک ہی ہے اور وہ بھی ناقابل تردید۔ کچھ حد تک اس کو یہ بات سمجھ آنی شروع ہوجاتی ہے کہ اس کی روانگی جو اُسے اس سے جدا کرے گی ان کی اس کہانی کے لئے ایک سازگار امر ہے۔ کہ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے جس سے شادی کی جائے، کہ وہ کسی بھی شادی سے نکل جائے گی، کہ اسے چھوڑ دینا چاہیئے، بھول جانا چاہیئے، اسے واپس گوروں کو لوٹا دینا چاہیئے، اُس کے بھائیوں کو۔

جب سے وہ اسکے جسم پر فریفتہ ہوا تھا، ننھی لڑکی کی اپنے جسم سے شکایت ختم ہوگئی تھی، اس کے دبلے پن سے، اور اسی طرح، حیرت انگیز طور پر اس کی ماں بھی پہلے کی طرح اس کا فکر نہیں کرتی تھی، یوں جیسے اس نے بھی یہ دریافت کرلیا تھا کہ بالاخر یہ جسم خوشنما تھا، قابل قبول، کسی بھی دوسرے جسم کی طرح سے۔ وہ، چولون والے عاشق کا خیال ہے کہ ننھی سفید فام لڑکی کی نشوونما بے انتہا گرمی کی وجہ سے تھم گئی ہے۔ وہ خود بھی اسی گرمی میں پیدا ہوا اور پلا بڑھا تھا۔ وہ اس کے ساتھ اپنا یہ رشتہ دریافت کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے یہاں گزارے ہوئے ان تمام سالوں نے، اس ناقابل برداشت عرض بلد نے اس کو انڈوچین کی ایک لڑکی میں تبدیل کردیا تھا، کہ اس کی کلائیوں میں اُن کی نزاکت ہے، اُن کے گھنے بال جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ساری

طاقت وہ اپنے اندر جذب کئے ہوئے ہیں، لمبے ان کے بالوں کی طرح، اور خصوصاً، یہ جلد، پورے جسم کی جلد، جو بارش کے پانی سے بنی ہے جو یہاں عورتوں، بچوں کے نہانے کے لئے رکھا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہاں کی عورتوں کے مقابلے میں، فرانس میں عورتوں کے جسموں کی سخت جلدیں ہوتی ہیں، تقریباً کھردری۔ وہ مزید کہتا ہے منطقہ حارہ کی کمزور خوراک، مچھلیوں، پھلوں پر مبنی، اس کا بھی اس میں کچھ حصہ ہے۔ اور پھر سوت اور ریشم جن سے لباس بنتے ہیں، یہ لباس ہمیشہ بڑے بڑے، جو جسم کو اپنے سے دور رکھتے ہیں، آزاد، برہنہ۔

چولون والا عاشق، ننھی سفید فام لڑکی کے عنفوان شباب کا بہت عادی ہوگیا ہے، کھو جانے کی حد تک۔ ہر شام جو لذت وہ اس سے لیتا ہے، اس کا سارا وقت، ساری زندگی اس کی نظر ہوگئی ہے۔ وہ اس کے ساتھ شاذ و نادر ہی بات کرتا ہے۔ شاید وہ سوچتا ہے کہ وہ اپنے بارے میں اس کی بات اب نہیں سمجھے گی، اس پیار کے بارے میں جسے وہ ابھی سمجھتا نہیں تھا اور جس کے بارے میں وہ کچھ کہنے سے قاصر تھا۔ شاید اس پر یہ انکشاف ہو رہا ہے کہ انہوں نے ابھی تک ایک دوسرے سے کبھی بات نہیں کی ہے، سوائے جب وہ ایک دوسرے کو شام کے وقت کمرے کی چیخوں میں پکار اٹھتے ہیں۔ ہاں، میرے خیال سے وہ نہیں جانتا تھا، اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ وہ نہیں جانتا تھا۔

وہ اس کی طرف دیکھتا ہے۔ آنکھیں موندے وہ ابھی بھی اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ اس کے چہرے کو اپنی سانس میں کھینچتا ہے۔ وہ بچی کو سانس میں کھینچتا ہے، آنکھیں موندے وہ اس کی سانس میں سانس لیتا ہے، یہ گرم ہوا جو لڑکی کے اندر سے نکل رہی ہے۔ اس کے لئے اس جسم کی حدود کا تعین کرنا مشکل سے مشکل تر ہورہا ہے، یہ جسم دوسرے اجسام کی مانند نہیں ہے، وہ مکمل نہیں ہے، کمرے کے اندر وہ ابھی بڑھ رہا ہے، ابھی اس کی کوئی مکمل ساخت نہیں ہے، مستقل وجود پذیر ہورہا ہے، صرف وہاں نہیں ہے جہاں اسے دکھائی دے رہا ہے، وہ کہیں اور بھی ہیں، وہ حد نظر کے پار پھیل رہا ہے، خطرے کی طرف، موت کی طرف، وہ نرم ہے، وہ پورے کا پورا لذت میں چلا جاتا ہے جیسے کہ وہ بالغ ہو، عمر میں، اس میں کوئی فریب نہیں ہے، خطرناک حد تک ذہین۔

میں دیکھا کرتی تھی جو وہ میرے ساتھ کرتا تھا، مجھے کیسے استعمال کرتا تھا، اور میں نے کبھی سوچا تک نہ تھا کہ کوئی ایسا کرسکتا تھا۔ وہ میری امید سے بڑھ کر میرے جسم کے نصیب کے مطابق عمل کرتا تھا۔ اس طرح میں اس کا بچہ بن گئی۔ اور وہ بھی میرے لئے کچھ اور بن گیا تھا۔ میں اس کے جسم کی، عضو تناسل کی، ناقابل وضاحت نرمی کو پہچاننے لگی تھی، اسکے وجود سے بالاتر۔ ایک اور آدمی کا سایہ بھی کمرے میں سے گزرتا ہوگا، ایک نوجوان قاتل کا، لیکن

مجھے ابھی اس کا علم نہیں تھا، ابھی میری آنکھوں کے سامنے کچھ نہیں آیا تھا۔ ایک نوجوان شکاری کا سایہ بھی کمرے میں سے گزرتا ہوگا مگر اس کے بارے میں، ہاں، مجھے علم تھا، وہ کبھی کبھی لذت میں موجود ہوتا تھا اور میں یہ اسے بتاتی تھی، چولون کے عاشق کو، میں اس کے ساتھ شکاری کے جسم اور اس کے عضو تناسل کی بات بھی کرتی تھی، اس کی ناقابل بیان نرمی، اس کی جرأت جنگل اور دریاؤں میں، جن کے دہانوں پر کالے چیتے ہوتے تھے۔ سب کچھ اس کی خواہش کے ہم آہنگ ہوتا اور وہ مجھے پیار کرتا۔ میں اس کا بچہ بن گئی تھی۔ وہ اپنے ہی بچے کے ساتھ ہر شام پیار کرتا تھا۔ اور کبھی کبھی اسے ڈر لگ جاتا تھا، اچانک ہی وہ اس کی صحت کے بارے میں فکرمند ہوجاتا تھا جیسے اس پر یہ انکشاف ہوا ہو کہ وہ فانی تھی اور اسے خیال آتا کہ وہ اسے کھوسکتا تھا۔ کہ وہ اتنی دبلی تھی، اچانک ہی، اور کبھی کبھی وہ ڈر جاتا، جانوروں کی طرح۔ اور یہ سَر کا درد بھی جو اکثر اسے ڈھیلا کردیتا ہے، پیلی، بے حرکت، آنکھوں پر ایک گیلی پٹی لئے۔ اور یہ نفرت جو اسے کبھی کبھی زندگی سے ہوتی، جب وہ اس کا شکار ہوتی، جب وہ اپنی ماں کے بارے میں سوچتی اور جب وہ اچانک چلا اٹھتی اور غصے سے روتی اس خیال سے کہ وہ کچھ بدلنے کی سکت نہیں رکھتی تھی، ماں کو اس کی موت سے پہلے خوش کرنے کے لئے، اس خرابی کے ذمہ دار لوگوں کو قتل کرنے کے لئے۔ اپنا چہرہ اس کے چہرے سے لگائے وہ اس کے آنسو سمیٹتا، اسے اپنے ساتھ بھینچ کر پیس ڈالتا، اس کے آنسوؤں کی

خواہش سے دیوانہ، اس کے غصے کی خواہش سے دیوانہ۔

وہ اسے ایسے لیتا ہے جیسے اپنے بچے کو لیتا ہو۔ وہ اپنے بچے کو بھی اسی طرح لیتا۔ وہ اپنے بچے کے جسم کے ساتھ کھیلتا ہے، وہ اسے الٹا کرتا ہے، وہ اس سے اپنا چہرہ، اپنے ہونٹ، اپنی آنکھیں ڈھانپ لیتا ہے۔ اور وہ، وہ اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑے جاتی ہے بالکل اسی سمت میں جو کہ چینی آدمی نے اختیار کی تھی جب اس نے یہ کھیل شروع کیا تھا۔ اور اچانک ہی اب وہ اس کی منت سماجت کرنے لگتی ہے، وہ یہ نہیں کہتی کہ کس لئے، اور وہ، وہ اسے چیخ کر چپ ہونے کو کہتا ہے، وہ چلاتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا، کہ وہ اس سے مزید لذت حاصل نہیں کرنا چاہتا، اور وہ پھر سے ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، خوف میں ساتھ جکڑے ہوئے، اور پھر ایک بار خوف چھٹ جاتا ہے، اور وہ پھر سے اس کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں، آنسوؤں میں، ناامیدی، خوشی میں۔

تمام شام وہ خاموش رہتے ہیں۔ کالی کار میں جو اسے واپس بورڈنگ سکول لے کر جاتی ہے، وہ اپنا سر اس کے کندھے سے ٹکا دیتی ہے۔ وہ اسے اپنے بازوؤں میں لے لیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اچھی بات ہے کہ جلد ہی فرانسیسی بحری جہاز پہنچ جائے گا اور اسے یہاں سے لے جائے گا اور انہیں ایک دوسرے سے جدا کردے گا۔ راستے کے دوران وہ چپ رہتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ ڈرائیور سے دریا کے ساتھ ساتھ چکر لگانے کو کہتا ہے۔ وہ سوجاتی

ہے، تھکی ماندی، اس کے پہلو سے لگی۔ وہ اسے بوسے دے کر جگاتا ہے۔

خوابگاہ میں روشنی نیلی ہے۔ اگربتیوں کی ایک خوشبو ہے، ہمیشہ شام ڈھلے اگربتیاں جلائی جاتی ہیں۔ دم گھٹنے والی گرمی ہے، تمام کھڑکیاں پوری کھلی ہیں اور ہوا کا ایک جھونکا بھی نہیں ہے۔ میں اپنے جوتے اتار لیتی ہوں تاکہ شور نہ کروں مگر مجھے اطمینان ہے، میں جانتی ہوں کہ نگہبان استانی نہیں اٹھے گی، کیونکہ اب اس بات کی اجازت ہے کہ میں رات کو جس وقت بھی چاہوں لوٹ سکتی ہوں۔ میں فوراً ہی ا۔ ل۔ کی جگہ دیکھنے جاتی ہوں، ہمیشہ ایک ہلکے سے خدشے کے ساتھ، ہمیشہ اس ڈر سے کہ وہ دن میں بورڈنگ سکول سے بھاگ گئی ہوگی۔ وہ موجود ہے۔ وہ گہری نیند سو رہی ہے، ا۔ ل۔ ایک سرکش، تقریباً مخالف نیند، مجھے یاد ہے۔ ٹھکرائی ہوئی۔ اس کے ننگے بازو آزادی سے اس کے سر کا گھیرا کئے ہوئے ہیں۔ اس کا جسم دوسری لڑکیوں کی طرح زیبائش کے ساتھ لیٹا ہوا نہیں ہے، اس کی ٹانگیں دوہری ہیں، اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا، اس کا تکیہ ٹیڑھا ہے۔ میں قیاس کرتی ہوں کہ اس نے میرا انتظار کیا ہوگا اور پھر اس طرح بے صبری، غصہ میں اسے نیند آ گئی ہوگی۔ وہ ضرور روئی بھی ہوگی اور پھر فراموشی میں ڈوب گئی ہوگی۔ میں چاہتی تو تھی کہ اسے جگاؤں اور ہم ایک دوسرے سے بہت دھیمی آواز میں باتیں کریں۔ میں چولون کے مرد کے ساتھ اب بات نہیں کرتی، وہ اب میرے ساتھ بات نہیں کرتا، میرے لئے ا۔ ل۔ کے سوالات سننا ضروری ہے۔ اس میں ان لوگوں

جیسی بے مثال توجہ ہے جو وہ بات نہیں سمجھتے جو ان سے کہی جاتی ہے۔ مگر میں اسے جگا نہیں سکتی۔ ایک مرتبہ اس طرح جگائی گئی، آدھی رات کے وقت، ا۔ ل۔ پھر دوبارہ نہیں سوسکتی۔ وہ جاگ جاتی ہے، وہ باہر جانا چاہتی ہے، اور ایسا کرتی ہے، سیڑھیاں اترتی ہے، وہ گردش خانوں میں جاتی ہے، بڑے بڑے خالی کھیل کے میدانوں میں، وہ بھاگتی ہے، وہ مجھے پکارتی ہے، وہ اتنی خوش ہوتی ہے، اس کے خلاف کچھ نہیں کیا جاسکتا، اور جب اسے سیر پر جانے سے منع کردیا جاتا ہے، تو سب جانتے ہیں کہ وہ یہی چاہتی ہے۔ میں ہچکچاتی ہوں، اور پھر نہیں، میں اسے نہیں جگاتی۔

مچھر دانی کے نیچے گرمی دم گھونٹتی ہے، جب مچھر دانی بند کرتے ہیں تو یہ گرمی کی شدت ناقابل برداشت محسوس ہوتی ہے۔ مگر میں سمجھتی ہوں کہ ایسا اس لئے ہے کیونکہ میں میں باہر سے آئی ہوں، دریا کے کناروں سے جہاں رات کے وقت ہمیشہ خنکی ہوتی ہے۔ مجھے اس کی عادت ہے، میں زیادہ ہلتی نہیں، میں اس شدت کے گزرنے کا انتظار کرتی ہوں۔ وہ گزر جاتی ہے۔ اپنی زندگی کی ان نئی تھکاوٹوں کے باوجود مجھے کبھی بھی فورا نیند نہیں آتی۔ میں چولون کے مرد کے بارے میں سوچتی ہوں۔ وہ اپنے ڈرائیور کے ساتھ لاسورس کی طرف ایک نائٹ کلب میں ہوگا، وہ خاموشی کے ساتھ پی رہے ہوں گے، جب وہ دونوں اکیلے ہوں تو چاولوں کی شراب پیتے ہیں۔ یا پھر وہ واپس لوٹ گیا ہے، وہ کمرے کی روشنی میں سوگیا ہے، ابھی بھی کسی سے بات

کیئے بغیر۔ اُس شام میں چولون کے مرد کے بارے میں سوچنا برداشت نہیں کرسکتی، میں ا۔ ل۔ کے بارے میں سوچنا برداشت نہیں کرسکتی۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کی زندگیوں میں خوشی ہے، کہ یہ خوشی انہیں اپنے باہر سے ملتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ میرے پاس اس سے ملتا جلتا کچھ نہیں ۔ ماں کا کہنا ہے: یہ لڑکی کبھی کسی چیز سے خوش نہیں ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ میری زندگی نے مجھ پر اپنا آپ عیاں کرنا شروع کردیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں ابھی سے اپنے آپ سے کہہ سکتی ہوں کہ مجھے مرنے کی ایک مبہم خواہش ہے۔ اس لفظ کو میں اب اپنی زندگی سے علیحدہ نہیں کرسکتی۔ میرے خیال سے مجھے تنہائی کی ایک مبہم خواہش ہے۔ مجھے یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ جب سے میں نے بچپن چھوڑا ہے، شکاری کا خاندان چھوڑا ہے، میں کبھی اکیلی نہیں رہی ہوں۔ میں کتابیں لکھوں گی۔ یہی ہے جو مجھے موجودہ لمحے کے پار دکھائی دے رہا ہے، اس وسیع صحرا میں جس کے نقوش کے نیچے میری زندگی میرے سامنے پھیلی ہوئی ہے۔

مجھے یہ یاد نہیں رہا کہ سائیگون سے آئے تار کے الفاظ کیا تھے۔ آیا یہ کہا گیا تھا کہ میرا چھوٹا بھائی فوت ہوگیا تھا یا یہ کہا گیا تھا: خدا کی طرف واپس بلالیا گیا۔ مجھے ایسا یاد آتا محسوس ہوتا ہے کہ لکھا تھا خدا کی طرف واپس بلالیا گیا۔ مجھ پر حقیقت عیاں ہوگئی: یہ وہ نہیں تھی جس نے یہ تار بھیجا ہے۔ چھوٹا بھائی۔ مرگیا۔ پہلے تو یہ بات ناقابل فہم ہے اور پھر، اچانک، ہر طرف سے،

دنیا کے دوسرے کنارے سے، درد اٹھتا ہے، اس نے مجھے دبالیا ہے، وہ مجھے اڑا کے ساتھ لے گیا ہے، مجھے کسی چیز کی پہچان نہ رہی، درد کے علاوہ میرا وجود ختم ہوگیا، کونسا درد، میں نہیں جانتی تھی کہ کونسا درد، کیا یہ چند ماہ قبل ایک بچہ کھونے کا درد تھا جو واپس آرہا تھا یا یہ کوئی نیا درد تھا۔ اب میرا خیال ہے کہ وہ ایک نیا درد تھا، میرا پیدا ہوتے ہی مرنے والا بچہ، جس سے میری کبھی بھی پہچان نہیں ہوئی تھی اور اس وقت میں اپنے آپ کو مارنا نہیں چاہتی تھی جیسے کہ اب چاہتی تھی۔

یہ ایک غلطی تھی۔ غلطی چند لمحوں میں پوری کائنات میں پھیل گئی تھی۔ میرا چھوٹا بھائی لافانی تھا اور انہیں یہ دکھائی نہیں دیا تھا۔ جب میرا بھائی زندہ تھا تو لافانیت اس کے جسم کے اندر چھپی ہوئی تھی اور ہم، ہمیں یہ دکھائی نہیں دیا تھا کہ یہی وہ جسم تھا جس کے اندر لافانیت قیام کئے ہوئے تھی۔ میرے بھائی کا جسم مرگیا تھا۔ لافانیت بھی اس کے ساتھ مرگئی تھی۔ اور اب دنیا ایسے ہی چل رہی تھی، اس لافانیت بردار جسم اور لافانیت سے محروم۔ یہ سراسر ایک غلطی تھی۔ وہ غلطی پوری کائنات میں پھیل گئی تھی، بدنامی۔

جس لمحہ وہ فوت ہوا تھا، وہ، چھوٹا بھائی، اس کے پیچھے پیچھے ہر چیز کو مرجانا تھا۔ اور اس کی وساطت سے۔ موت، ایک زنجیر کی طرح، اس سے شروع ہوئی تھی، اُس بچے سے۔

بچے کا مردہ جسم، وہ، ان واقعات سے لاپروا تھا جو اس کی وجہ سے وقوع

پذیر ہوئے تھے۔ لافانیت جسے اس نے اپنی 27 سالہ زندگی کے دوران پناہ دی تھی، وہ اس کا نام تک نہیں جانتا تھا۔

کسی کو بھی صاف دکھائی نہیں دیتا تھا سوائے میرے۔ اور جب مجھے یہ علم حاصل ہوگیا، آسان سا علم، یہ جاننے کا علم کہ میرے چھوٹے بھائی کا جسم ہی میرا بھی جسم تھا، مجھے بھی مرنا تھا، مجھے بھی مرنا تھا۔ اور میں مرچکی ہوں۔ میرے چھوٹے بھائی نے مجھے اپنے ساتھ ملا لیا ہے، اُس نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا ہے اور میں مرچکی ہوں۔

لوگوں کو ایسی چیزوں کے بارے میں آگاہ کرنا چاہیئے۔ انہیں یہ بتلانا چاہیئے کہ لافانیت ہی فانیت ہے، کہ وہ مرسکتی ہے، کہ یہ پہلے بھی ہوتا رہا ہے، اور کہ یہ اب بھی ہوتا ہے۔ کہ وہ بذات خود اپنے بارے میں اعلان نہیں کرتی، کبھی نہیں، کہ وہ مکمل دھوکے بازی ہے۔ اس کا وجود تفصیلات میں نہیں ہے بلکہ صرف اصولی۔ کچھ لوگوں کو اس کے وجود کا علم ہوسکتا ہے بشرطیکہ وہ لاعلم ہوں کہ وہ یہ جانتے ہیں۔ ایسے ہی کچھ دوسرے لوگ اس کی ان لوگوں میں موجودگی کی کھوج لگاسکتے ہیں، بشرطیکہ وہ اس کی طاقت سے لاعلم ہوں۔ زندگی اس وقت تک لافانی ہے جب تک یہ جیئے جارہی ہو، جب تک وہ زندہ ہے۔ لافانیت وقت کی کمی بیشی کا سوال نہیں ہے کہ یہ لافانیت کا سوال نہیں ہے، کہ یہ کسی اور چیز کا سوال ہے جو نامعلوم ہی رہتی ہے۔ یہ کہنا اتنا ہی غلط ہے

کہ وہ آغاز اور انجام کے بغیر ہے جیسے کہ کہنا کہ وہ روح کی زندگی کے ساتھ شروع اور ختم ہوتی ہے، کیونکہ یہ روح اور خلا کے تعاقب دونوں میں شریک ہے۔ صحراؤں کی مردہ ریت کو دیکھئے، بچوں کے مردہ جسموں کو دیکھئے: لافانیت وہاں سے نہیں گزر پاتی، وہ رُک جاتی ہے اور دوسرا راستہ اختیار کرلیتی ہے۔

میرے چھوٹے بھائی کے معاملہ میں لافانیت بے عیب تھی، بغیر سرخی کے، ہموار، خالص، منفرد۔ میرے چھوٹے بھائی کے پاس صحرا میں رونے کے لئے کچھ نہیں تھا، اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا، کہیں اَور یا یہاں، کچھ بھی نہیں۔ وہ پڑھا لکھا نہیں تھا، وہ کبھی بھی کچھ بھی سیکھنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ اس کو بولنا نہیں آتا تھا، وہ بمشکل ہی پڑھ سکتا تھا، بمشکل ہی لکھ سکتا تھا، کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اسے دکھ جھیلنا بھی نہیں آتا تھا۔ وہ ایک شخص تھا جو سمجھ نہیں پا رہا تھا اور جو خوفزدہ تھا۔

میرے اندر جو اس کے لئے جنونی محبت ہے، وہ میرے لئے ایک ناقابلِ ادراک معمہ ہے۔ میں نہیں جانتی کہ مجھے اس سے اس حد تک محبت کیوں تھی، کہ میں اس کی موت مرنے کی خواہش رکھتی تھی۔ مجھے اس سے جدا ہوئے دس سال گذر چکے تھے جب یہ ہوا اور میں شاذ و نادر ہی اس کے بارے میں سوچا کرتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ میں اسے ہمیشہ کے لئے محبت کرتی تھی اور اس محبت میں کوئی نئی چیز حائل نہیں ہوسکتی تھی۔ میں موت کو بھول چکی

تھی۔

ہم اکٹھے بہت کم باتیں کرتے تھے، ہم بڑے بھائی کے متعلق، اپنی ماں کے چٹیل میدان کی بدنصیبی کے متعلق بہت کم باتیں کرتے تھے۔ اس کی بجائے ہم شکار، بندوقوں، مشینوں اور کاروں کے بارے باتیں کرتے۔ وہ ہماری ٹوٹی پھوٹی کار پر غصے میں آجاتا اور مجھے ان کاروں کے بارے میں تفصیل سے بتاتا جو اس کے پاس بعد میں ہوں گی۔ میں شکاری بندوقوں اور کاروں کے تمام برانڈوں سے واقف ہوگئی تھی۔ ہم، ظاہر ہے، اس بارے میں بھی باتیں کرتے کہ اگر ہم محتاط نہیں ہوئے تو چیتے ہمیں پھاڑ کھائیں گے یا پھر ہم دریا میں ڈوب جائیں گے اگر ہم دریا کی تیز موجوں میں تیراکی کرتے رہے۔ وہ مجھ سے دو سال بڑا تھا۔

ہوا رک گئی ہے اور درختوں کے نیچے ایک مافوق الفطرت قسم کی روشنی ہے جو بارش کے بعد نمودار ہوتی ہے۔ پرندے اپنی تمام طاقت سے چیخ رہے ہیں۔ پاگل پرندے، وہ ٹھنڈی ہوا سے اپنی چونچوں کو تیز کررہے ہیں اور ہر طرف تقریباً بہرا کردینے والا شور مچا رہے ہیں۔

بحری جہاز دریائے سائیگون پر چلتے، انجن بند، ٹگ انہیں کھینچ کر دریائے میکونگ کے موڑ پر واقع بندرگاہ کی مشینوں تک لے جاتے جوکہ اسی عرض بلد پر واقع ہے جیسے کہ سائیگون۔ دریائے میکونگ کا یہ موڑ یا شاخ دریا کہلاتی ہے، دریائے سائیگون۔ یہاں پڑاؤ آٹھ دن کا ہوتا۔ جونہی بحری جہاز گھاٹ

پر لنگرانداز ہوتے تو فرانس کا سا سماں بندھ جاتا۔ لوگ فرانس جاکر عشائیہ کھاسکتے تھے، وہاں رقص کرسکتے تھے، میری ماں کے لئے یہ بہت مہنگا تھا اور اس کے علاوہ اس کے لیے اس کا مقصد بھی کوئی نہیں تھا، لیکن اس کے ساتھ، چولون والے عاشق کے ساتھ، ہم وہاں جاسکتے تھے۔ وہ وہاں اس لئے نہیں جاتا تھا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ کہیں لوگ اس کو اتنی چھوٹی جوان گوری لڑکی کے ساتھ نہ دیکھ لیں، اس نے کبھی یہ کہا نہیں لیکن لڑکی جانتی تھی۔ اُس زمانے میں، اور یہ اتنی پرانی بات نہیں ہے، بمشکل پچاس سال قبل، دنیا میں کہیں بھی جانے کے لئے صرف بحری جہاز ہی تھے۔ برّاعظموں کے زیادہ تر حصے سڑکوں اور ریل گاڑیوں کے بغیر تھے۔ سیکڑوں، ہزاروں مربع کیلومیٹر پر ابھی صرف قبل از تاریخ کے راستے ہی تھے۔ یہ جہاز راں کمپنی، میساژری ماری تیم، کے خوبصورت جہاز تھے، کمپنی کے مسکٹ سے لیس سپاہی، پورتھوس، دارتانیاں، لارامس، جو ہند چین کو فرانس سے ملاتے تھے۔

وہ سفر چوبیس دن طویل تھا۔ بحری کمپنیوں کے یہ جہاز قصبوں کی طرح تھے، گلیوں، شراب خانوں، قہوہ خانوں، کتب خانوں، دیوانوں، ملاقاتوں، عاشقوں، شادیوں، اموات کے ساتھ۔ اتفاقیہ انجمنیں بنتیں، جبری تھیں، ہر کوئی جانتا تھا، اور بھولتا نہیں تھا، اور اسی وجہ سے وہ قابل برداشت تھیں۔ اور کبھی کبھار ناقابل فراموش خوشی بھی فراہم کرتی تھیں۔ عورتوں کے لئے صرف یہ سفر ہی ممکن تھے۔ خاص طور پر ان میں سے زیادہ تر کے لئے اور کبھی کبھار

بعض مردوں کے لئے بھی، سفر کر کے کالونی میں جانا ایک ایک حقیقی کارنامہ تھا۔ ماں کے لئے یہ سفر، ہمارے بچپن کے دنوں کے ساتھ، ہمیشہ بقول اس کے، ''اس کی زندگی کے خوش ترین دن'' تھے۔

روانگیاں۔ یہ ہمیشہ وہی روانگیاں تھی۔ یہ ہمیشہ سمندر پر پہلی روانگیاں تھیں۔ زمین سے علیحدگی ہمیشہ دکھ درد اور اسی افسردگی میں ہوتی، لیکن اس نے آدمیوں کو سفر پر جانے کے لئے کبھی نہیں روکا، یہودی، فلسفی، اور سمندر پر یکتا سفر کرنے والے خالص مسافر، اور اس نے عورتوں کو بھی کبھی نہیں روکا تھا کہ وہ ان کو سفر پر جانے دیں، عورتیں جو خود کبھی سفر پر نہیں جاتی تھیں، وہ جو پیدائشی جگہ کی حفاظت کرنے کے لئے ٹھہر جاتی تھیں، نسل کی، جائداد کی، اور واپسی کی وجہ ہونے کے لئے۔ آج کل کی بنسبت صدیوں کے دوران، بحری جہازوں کے سفر زیادہ سست رفتار بھی ہوتے اور زیادہ خطرناک بھی۔ سفر کی طوالت فاصلے کی لمبائی کو قدرتی طور پر پورا کرتی۔ لوگ زمین اور سمندر پر اس سست رفتاری، اس تاخیر کے، ہوا، خوشگوار موسم، جہاز کی سمندر میں تباہی، سورج، اور موت کے انتظار کے عادی ہو چکے تھے۔ وہ بحری جہاز جن سے چھوٹی گوری لڑکی واقف تھی، وہ دنیا کے آخری ڈاک جہازوں میں شامل تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی جوانی میں پہلی ہوائی جہاز کی کمپنیاں قائم ہوئی تھیں جنہوں نے بتدریج نوعِ انسانی کو سمندروں کے سفر سے محروم کر دیا۔

ہم اب بھی روزانہ چولون کے فلیٹ میں جاتے۔ وہ معمول کے مطابق کرتا، کافی عرصے تک وہ معمول کے مطابق کرتا رہا، وہ مجھے مٹکوں کے پانی سے غسل دیتا اور مجھے اٹھا کر بستر پر لے جاتا۔ وہ میرے پاس آتا، وہ لیٹ بھی جاتا لیکن اس میں کچھ بھی طاقت نہیں تھی، کچھ بھی قوت نہیں۔ جب میری روانگی کی تاریخ طے ہوگئی، حالانکہ ابھی دور تھی، وہ میرے جسم کے ساتھ کچھ بھی کرنے کے قابل نہ رہا۔ یہ سب کچھ اچانک واقع ہوا تھا، اس کی لاعلمی میں۔ اُس کے جسم کو اِس کے جسم کی کوئی خواہش نہیں تھی جو اب یہاں سے جانے والی تھی، دغا دے رہی تھی۔ وہ کہتا: میں اب تم سے پیار نہیں کرسکتا، میرا خیال تھا کہ میں کرسکتا تھا، لیکن میں نہیں کرسکتا۔ وہ کہتا کہ وہ مرچکا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک میٹھی اور شرمندہ سی مسکراہٹ ہوتی، وہ کہتا کہ شاید اب یہ کبھی بھی واپس نہ آئے۔ میں اس سے پوچھتی کہ کیا وہ یہی چاہتا تھا۔ وہ تقریباً ہنستے ہنستے، کہتا: مجھے پتہ نہیں، اس لمحے شاید ہاں۔ اس کی مروّت درد میں بھی پوری طرح قائم تھی۔ اُس نے اِس درد کے بارے میں بات نہیں کی، اس نے اس کے بارے میں کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ کبھی کبھی اس کا چہرہ کانپنے لگتا، وہ اپنی آنکھیں بند کرلیتا، اور اپنے دانتوں کو بھینچ لیتا۔ لیکن اس نے کبھی ان تصویروں کے بارے میں بات نہیں کی جو اُسے اپنی بند آنکھوں کے پیچھے دکھائی دیتی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ اسے اس درد سے محبت تھی، کہ اُسے اِس سے اتنی ہی محبت تھی جتنی مجھ سے، بہت شدید، شاید موت کی حد

تک، کہ اب وہ اسے مجھ سے زیادہ پسند کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ کہتا کہ وہ مجھے چمکارنا چاہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مجھے اس کی بہت خواہش ہے، اور وہ مجھے اُس وقت دیکھنا چاہتا ہے جب لذت عروج پر ہو۔ تو وہ ایسے ہی کرتا، وہ اسی لمحے میری طرف دیکھتا اور مجھے اپنی بچی کہہ کر پکارتا۔ ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ ہم ایک دوسرے سے ملنا بند کردیں گے، لیکن یہ ناممکن تھا، یہ ناممکن ہوگیا۔ ہر شام میں اُسے لیسے کے سامنے اپنی کالی کار میں بیٹھے ہوئے دیکھتی، شرم سے اپنا سر ایک طرف کئے ہوئے۔

جب روانگی کا وقت نزدیک آ گیا، تو جہاز نے زور دار آواز میں، تین، بہت لمبے، سائرن بجائے، جن کی آواز پورے شہر میں پہنچ گئی اور بندرگاہ کے اوپر آسمان سیاہ ہوگیا۔ پھر ٹگ جہاز کے قریب پہنچے اور اسے دریا کے بیچ کھینچ کر لے گئے۔ جب یہ ہوگیا، تو ٹگوں نے اپنے زنجیر دار لنگر کھول دیئے اور واپس بندرگاہ کی طرف آ گئے۔ اِس کے بعد جہاز نے ایک مرتبہ پھر الوداع کہا، اس نے پھر اپنے زوردار اور پُراسرار طور پر اداس واویلا کیا، جس سے ہر کسی نے رونا شروع کردیا، صرف سفر کرنے والے لوگ ہی نہیں، جو جدا ہو رہے تھے بلکہ وہ بھی جو صرف دیکھنے کے لئے آئے تھے، اور وہ جو کسی خاص وجہ کی بناء پر وہاں نہیں تھے، جن کے دماغ میں یاد کرنے کے لئے کوئی خاص شخص نہیں تھا۔ جہاز نے، پھر، آہستہ آہستہ، اپنی ہی طاقت سے دریا میں

چلنا شروع کردیا۔ کافی دیر تک اس کا اونچا سا ڈھانچہ سمندر میں چلتے ہوئے نظر آتا رہا۔ بہت سے لوگ اسے دیکھنے کی غرض سے وہاں ٹھہرے رہے، اور اپنے سکارفوں، اپنے رومالوں سے آہستہ سے آہستہ تر اشارے کرتے رہے، زیادہ سے زیادہ اداس۔ اور پھر آخر میں، زمین نے جہاز کی شکل کو اپنی خمیدگی میں چھپالیا۔ صاف موسم میں وہ آہستہ آہستہ ڈوبتا ہوا نظر آتا تھا۔

جب جہاز نے اپنا پہلا الوداع کہا تھا، جب جہاز کے جڑ تختے کو اوپر اٹھالیا گیا تھا اور ٹگوں نے اسے کھینچنا شروع کیا تھا، اسے زمین سے دور لے جانے کے لئے تو لڑکی بھی روئی تھی۔ اُس نے یہ اپنے آنسو دکھائے بغیر کیا تھا، کیونکہ وہ چینی تھا اور اس قسم کے عاشقوں کے لئے رونا نہیں چاہیئے۔ اپنی ماں اور اپنے چھوٹے بھائی کو دکھائے بغیر کہ اسے کوئی غم تھا، بغیر کچھ دکھائے جیسے کہ اُن کا آپس میں معمول تھا۔ چینی آدمی کی بڑی کار وہاں تھی، لمبی اور کالی، اور اگلی نشست پر، سفید وردی والا شوفر۔ کار میساژری ماری تیم کی کار پارک سے ہٹ کر کھڑی تھی، اکیلی۔ اُس نے ان اشاروں سے کار کو پہچان لیا تھا۔ پیچھے وہ بیٹھا ہوا تھا، بمشکل دکھائی دینے والی شکل، بے حرکت، شکست خوردہ۔ لڑکی جنگلے سے ٹیک لگائے کھڑی تھی، جیسے کہ پہلی دفعہ کشتی میں۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ بھی اسے دیکھ رہی تھی، وہ اب اس کو دکھائی تو نہیں دے رہا تھا لیکن اس کے باوجود وہ کالی کار کے ڈھانچے

کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور پھر آخر میں وہ اسے دکھائی نہیں دیا۔ بندرگاہ بتدریج اوجھل ہوگئی تھی اور پھر زمین بھی۔

بحیرۂ چین، بحیرۂ احمر، بحر ہند، نہر سویز تھے، اور جب صبح آنکھ کھلتی تو ارتعاش کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ پتہ چل جاتا تھا کہ آپ ریت میں سے گزر رہے ہیں۔ لیکن سب سے پہلے، وہ سمندر تھا۔ وہ جو سب سے زیادہ دور فاصلہ پر تھا، سب سے وسیع، وہ جو قطب جنوبی تک پھیلا ہوا تھا، عارضی قیاموں کے درمیان سب سے زیادہ لمبا، سیلون اور صومالیہ کے درمیان۔ کبھی کبھار وہ اتنا ساکت ہوتا اور موسم اتنا صاف، اور اتنا خوشگوار، کہ اس کو پار کرتے ہوئے یہ محسوس ہوتا تھا کہ سمندر پر سفر نہیں بلکہ کچھ اور تھا۔ پھر تمام جہاز کھول دیا جاتا، دیوان خانے، جڑ تختے، روشن دان۔ مسافر اپنے تپش دار کیبن سے بھاگ نکلتے اور عرشہ پر ہی سو جاتے۔

ایک سفر کے دوران، اسی سمندر کو پار کرتے ہوئے، رات گئے، کوئی شخص فوت ہوگیا۔ لڑکی کو اب یاد نہیں کہ یہ واقعہ اس سفر کے دوران یا کسی دوسرے سفر کے دوران پیش آیا تھا۔ کچھ لوگ درجۂ اول کے شراب خانے میں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے، ان کھلاڑیوں میں ایک نوجوان بھی تھا، اور کسی ایک خاص لمحے، اس نوجوان نے، بغیر ایک لفظ کہے، اپنے تاش کے پتے واپس

رکھ دیئے، شراب خانہ سے باہر نکلا، بھاگتے بھاگتے عرشہ کو پار کیا اور سمندر میں چھلانگ لگادی۔ جب تک پوری رفتار سے چلتے ہوئے جہاز کو روکا گیا، اس وقت تک نعش کا کوئی نام ونشان نہیں تھا۔

نہیں، یہ لکھتے ہوئے، اسے جہاز نہیں بلکہ ایک دوسری جگہ دکھائی دے رہی ہے، وہ جہاں اس نے کسی کو یہ کہانی سناتے ہوئے سنا تھا۔ یہ سادیک تھا۔ وہ سادیک کے ڈسٹرکٹ آفیسر کا بیٹا تھا۔ لڑکی اسے جانتی تھی، وہ بھی سائیگون کے لیسے میں پڑھتا تھا۔ لڑکی کو وہ یاد ہے، بہت لمبا، شریفانہ چہرہ، رنگ بھورا، دورہ شاخی عینکیں۔ اس کی کیبن سے کچھ نہیں ملا تھا، کوئی خط نہیں۔ اس کی عمر یادداشت میں ابھی تک ہے، دہشت ناک، وہی، سترہ سال۔ جہاز پو پھٹنے پر ہی دوبارہ روانہ ہوگیا تھا۔ سب سے زیادہ دل دکھانے والی بات یہی تھی۔ طلوعِ آفتاب، خالی سمندر، اور تلاش کو ختم کرنے کا فیصلہ۔ جدائی۔

اور پھر ایک دوسرے وقت کی بات ہے، یہ ابھی اسی سفر کے دوران پیش آیا تھا، اسی سمندر کو پار کرتے وقت، معمول کے مطابق رات کا آغاز ہو چکا تھا، بڑے عرشہ کے بڑے لاؤنج میں ایک دم شوپیں کی ایک والٹز کی موسیقی کا شور بلند ہوا جسے وہ پوشیدہ اور قریبی طور پر جانتی تھی کیونکہ اس نے اِسے مہینوں سیکھنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اِسے ٹھیک طرح بجانے میں کبھی کامیاب نہیں

ہوئی تھی، کبھی نہیں، اور جس کے نتیجے میں اس کی ماں رضامند ہوگئی تھی کہ وہ پیانو سیکھنا بند کردے۔ اُس رات، دوسری ان گنت راتوں میں کھوئی ہوئی ایک رات، اس پر اسے پورا یقین تھا، نوجوان لڑکی نے اس جہاز پر گزاری تھی اور وہ اس وقت وہاں ہی تھی جب یہ وقوع پذیر ہوا، ٹمٹماتے ہوئے آسمان کی آب و تاب کے نیچے اس شوپیں کی موسیقی کا پھوٹنا۔ ہوا کا ایک جھونکا بھی نہیں تھا اور موسیقی کالے بحری جہاز کے کونے کونے میں پھیل گئی تھی، جیسے کہ یہ آسمان سے کوئی فرمان تھا جس کی اہمیت کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا، ایک خدائی حکم جو ناقابل فہم تھا۔ اور لڑکی اٹھ کر کھڑی ہوگئی تھی جیسے کہ وہ اپنی باری اپنے آپ کو مار دے، اپنی باری اپنے آپ کو سمندر میں پھینک دے اور اس کے بعد وہ روئی تھی کیونکہ اسے اس چولون والے آدمی کی یاد آئی تھی اور ایک دم اسے یقین نہیں تھا کہ اس نے اس سے بھی ایسی محبت سے محبت نہ کی ہو جسے وہ دیکھ نہیں سکی تھی کیونکہ وہ کہانی میں ایسے کھوگئی تھی جیسے کہ پانی ریت میں اور جسے اس نے صرف اب اس لمحہ سمندر کی طرف پھینکی ہوئی موسیقی کی بدولت دوبارہ پایا تھا۔

جیسے کہ بعد میں چھوٹے بھائی کی ابدیت موت کے ذریعے۔

اس کے ارد گرد لوگ سو رہے تھے، موسیقی سے ملفوف لیکن اس سے

جگائے ہوئے نہیں، بہت آرام سے۔ لڑکی نے سوچا کہ اس نے ابھی ابھی پُرسکون ترین رات کو دیکھا تھا جو بحر ہند میں کبھی بھی واقع ہوئی تھی۔ اس کا خیال ہے کہ اُسی رات کے دوران اُس نے اپنے چھوٹے بھائی کو ایک عورت کے ساتھ عرشہ پر آتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے جنگلے کے ساتھ ٹیک لگائی ہوئی تھی، عورت نے اسے اپنی بانہوں میں لیا ہوا تھا اور وہ ایک دوسرے کو بوسے دے رہے تھے۔ لڑکی ٹھیک طرح دیکھنے کی خاطر چھپ گئی تھی۔ اس نے عورت کو پہچان لیا تھا۔ وہ اور چھوٹا بھائی پہلے ہی سے اکٹھے ہوتے تھے۔ وہ عورت شادی شدہ تھی۔ یہ ایک مردہ جوڑا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ خاوند کو کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ سفر کے آخری دنوں میں چھوٹا بھائی اور عورت پورا دن کیبن میں گذارتے تھے، وہ صرف رات کو باہر نکلتے تھے۔ انہی دنوں میں یوں لگتا تھا کہ چھوٹا بھائی اپنی ماں اور اپنی بہن کو ایسے دیکھتا تھا جیسے کہ وہ انہیں پہچانتا ہی نہیں۔ ماں تلخ، خاموش، حاسد سی ہوگئی تھی۔ وہ، چھوٹی لڑکی، وہ روتی۔ وہ خوش تھی، اس کا خیال تھا، اور ساتھ ساتھ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ چھوٹے بھائی کا بعد میں کیا بنے گا۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ انہیں چھوڑ دے گا، کہ وہ اس عورت کے ساتھ چلا جائے گا، لیکن نہیں، وہ فرانس واپس آنے پر اُن کے ساتھ ہی آ گیا تھا۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ گوری لڑکی کی روانگی کے کتنے عرصے بعد اُس آدمی نے اپنے والد کے حکم کی تعمیل کی، جب اُس نے اس کے حکم کے مطابق اُس

لڑکی سے شادی کی جسے خاندانوں نے دس سال پہلے اُس کے لئے چنا تھا، لڑکی جو دوسروں کی طرح سونے، ہیرے جواہرات اور یشب سے لدی ہوئی تھی۔ وہ بھی شمالی علاقے کی ایک چینی لڑکی تھی، جو فوچوین کے شہر سے اپنے رشتہ داروں کے ساتھ وہاں آئی تھی۔

وہ یقیناً کافی عرصہ تک اس قابل نہیں ہوا ہوگا کہ وہ اس کے ساتھ ملے تاکہ اسے ان کی دولت کا وارث دے۔ گوری لڑکی کی یاد یقیناً وہاں موجود ہوگی، لیٹی ہوئی، وہاں، بستر کے دوسری طرف۔ وہ یقیناً ایک لمبے عرصے تک اس کی خواہش کی ملکہ رہی ہوگی، جذبات کے ساتھ ایک ذاتی رابطہ، شفقت کی لامحدود وسعت کے ساتھ، جسم کی تاریک اور بھیانک گہرائیوں کے ساتھ۔ اور پھر ایک دن آیا ہوگا جب یہ ممکن ہوگیا۔ بالکل وہی دن جب گوری لڑکی کے لئے خواہش اتنی زیادہ تھی، اتنی حد تک ناقابل برداشت کہ اس کو لڑکی کی پوری تصویر دکھائی دی ہوگی جیسے کہ اسے بہت زیادہ اور تیز بخار ہو اور پھر وہ گوری بچی کی خواہش میں دوسری عورت میں داخل ہوا ہوگا۔ اُس نے یقیناً اپنے آپ کو اس عورت کے اندر ایک جھوٹ کی بنا پر پایا ہوگا، اور جھوٹ سے ہی وہ کچھ کیا ہوگا جس کی ان کے خاندان، عالم بالا، شمال کے آباؤ اجداد کو اُس سے توقع تھی، یعنی کہ نام کے وارث کی۔

شاید وہ عورت گوری لڑکی کے بارے میں جانتی تھی۔ اُس کے ہاں سادیک کی رہنے والی ملازمائیں تھیں جو اُس کہانی سے آگاہ تھیں اور جنہوں

نے یقیناً بات کی ہوگی۔ وہ اُس کے درد سے بھی ناواقف نہیں ہوگی۔ ان دونوں کی عمر بھی یقیناً ایک ہی ہوگی، سولہ سال۔ اُس رات کو، کیا اُس نے اپنے خاوند کو روتا دیکھا تھا؟ اور، یہ دیکھنے پر، اُس نے اسے دلاسہ دیا تھا؟ کیا سولہ سال کی ایک لڑکی، 1930 کی دہائی کے زمانے کی ایک چینی منگیتر، اس قسم کی بدکاری کے درد کے لئے، ناشائستگی کئے بغیر، دلاسہ دے سکتی تھی جس کا خمیازہ وہ خود بھگت رہی تھی۔ کون جانتا ہے؟ شاید وہ غلطی کررہی ہو، شاید دوسری لڑکی اُس آدمی کے ساتھ پوری رات روتی رہی ہو، ایک لفظ بھی کہے بغیر۔ اور پھر محبت واپس آگئی ہوگی، آنسوؤں کے بعد۔

اُس کو، گوری لڑکی کو ان احوال کے بارے میں کبھی نہیں پتہ چلا۔

جنگ کے کئی سالوں کے بعد، شادیوں، بچوں، طلاقوں، کتابوں کے بعد، وہ اپنی بیوی کے ساتھ پیرس آیا تھا۔ اُس نے اُسے فون کیا تھا۔ میں ہوں۔ اُس نے آواز سنتے ہی پہچان لیا تھا۔ اُس نے کہا تھا: میں صرف آپ کی آواز سننا چاہتا تھا۔ عورت نے کہا تھا: میں ہوں، بوں ژور۔ اُس پر گھبراہٹ چھائی ہوئی تھی، وہ پہلے کی طرح ڈر رہا تھا۔ یک لخت اس کی آواز کپکپانے لگی۔ اور اس کپکپاہٹ کے ساتھ ہی، یک لخت، عورت کو چین کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے کتابیں لکھنا شروع کردیا تھا، اُسے اِس کے بارے میں اُس کی ماں سے پتہ چلا تھا جس سے اُس کی ملاقات سائیگون میں

ہوئی تھی۔ اور چھوٹے بھائی کے بارے میں بھی، کہ وہ اس کے لئے سوگوار تھا۔ اور پھر اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اُس سے کیا کہے۔ اور پھر اُس نے اسے کہا تھا۔ اُس نے اُسے کہا تھا کہ اب بھی پہلے ہی کی طرح تھا، کہ وہ اُس سے ابھی تک محبت کرتا تھا، کہ وہ اُس سے محبت کرنا کبھی بھی ترک نہیں کرسکتا، کہ وہ اُس سے موت تک محبت کرتا رہے گا۔

نوفل۔ ل۔ شاتو
فروری۔ مئی 1984ء

ISBN 969-516-153-7

9 789695 161531

www.alhamra.com

Marguerite Duras
L'amant
(Urdu)